نومبر ۲۰۱۲ء

قیمت: ۱۸ روپے

ماھنامہ

شاعر

بمبئی

اشاعت کا ۸۳ واں سال
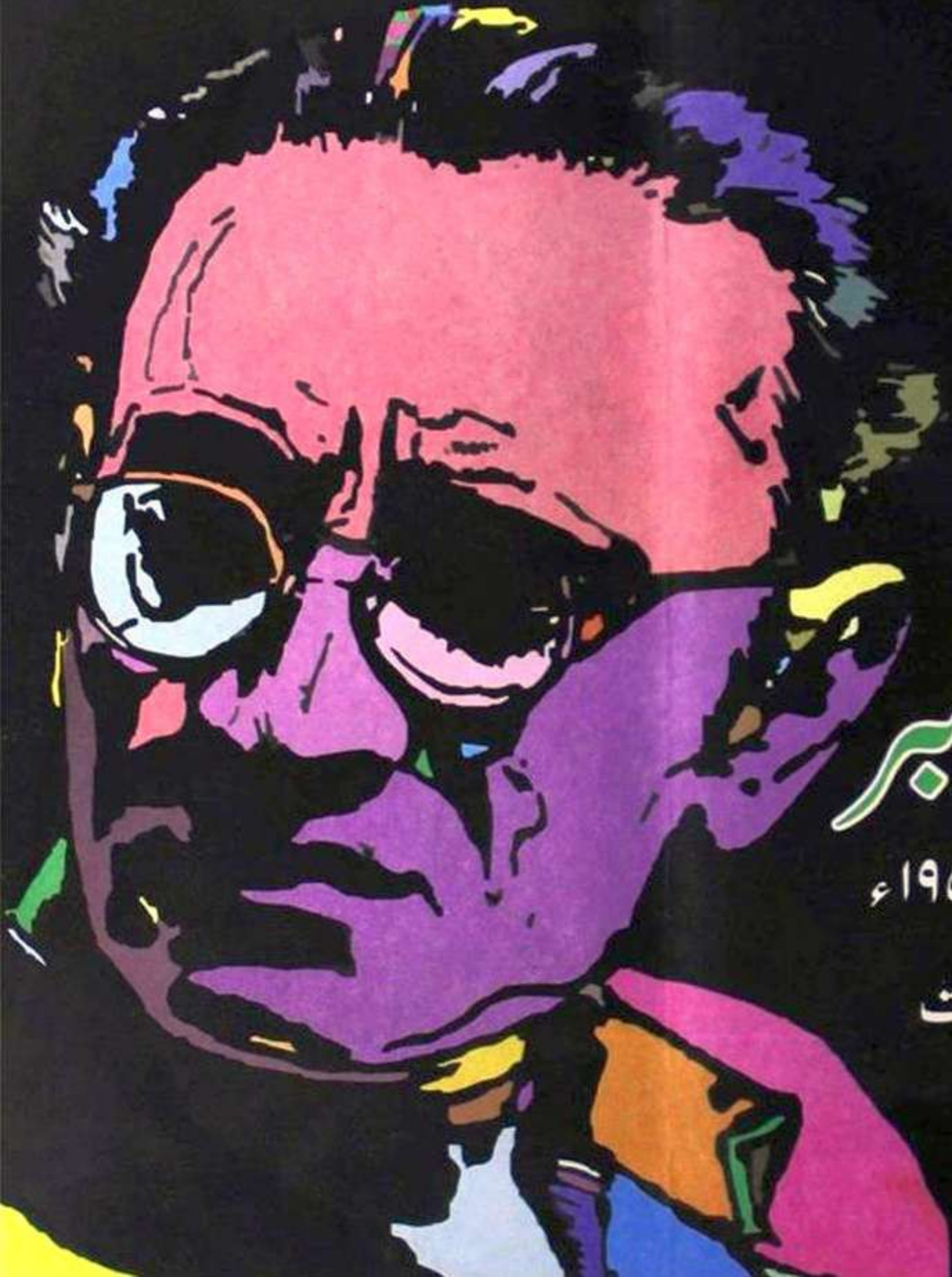
شاعر منٹو نمبر

مارچ، اپریل ۱۹۵۵ء

کی مکرّر اشاعت

ڈاکٹر شاہد میر

کہنے کو تو ہیں غزل رسیا، لیکن ان کے تخلیقی اظہاریوں میں، گیت اور دوہے بھی ہیں۔ دونوں ہی اصناف سے شاہد میر کو عشق ہے، بالخصوص دوہے سے اس صنف کو انھوں نے موضوع کرتے ہوئے ایک کارآمد حوالہ جاتی کتاب اردو والوں کی دی ہے۔

دوہے عالمگیر

(دوہوں کا عالمی انتخاب)

اس کتاب کے ابواب میں

☆ پیش لفظ ☆ دوہے پرسمواد (گفتگو) ☆ دوہے: عالمی انتخاب ☆ دوہے: صدیوں کا سفر ☆ دوہے کی تعریف میں: دوہے تقریباً ۱۲۵ دوہا نگاروں کے دوہے تلاشنا اور پھر ان میں دوہے کے فن پر مضامین کے ساتھ باندھنا، وقت طلب کام ہے ڈاکٹر شاہد میر نے انجام دیا ہے۔ ایک فن کار جس کا وجدان شاعرانہ اور مزاج موسیقانہ ہے۔ اردو جہان میں بہت کم فن کار ڈاکٹر شاہد میر کی ہم سری کرتے ہیں۔ رسالہ شاعر نے گوشۂ طاہر سعید ہارون (اپریل ۲۰۰۹ء) کے شمارے کو معاصر دوہے سے منسوب کر دیا تھا۔ اب اردو شعراء رباعی، دوہا، گیت کی طرف بھی متوجہ ہوئے ہیں۔

دوھا بھنڈار میں تقریباً ۱۲۵ شعراء کے دوھے شامل ھیں.

اپنے انتخاب کے بارے میں شاہد میر نے ایک دوہا بھی تخلیق کر کے انتخاب میں شامل کر لیا ہے۔

آسمان کی ہے جھلک دھرتی کی تصویر
لوگو پڑھ کر دیکھ لو "دوہے عالمگیر"

کتاب میں ڈاکٹر شاہد میر کا تحقیقی پیش لفظ بھی خاصے کی چیز ہے۔ دوہے پرسمواد (گفتگو) کے تحت، قدر بلگرامی، حسن عسکری، پروفیسر گوپی چند نارنگ، وزیر آغا، گیان چند جین، شین کاف نظام، ظہیر غازی پوری، مختار ٹونکی، علی احمد جلیلی، علیم صبا نویدی، انور رواغ، سمیع اللہ اشرفی، شکیل گوالیاری، سلیم انصاری، دیویندر شرما، شیام پرمار، بشیر بدر، یوسف ناظم اور مظفر حسین ایسے بالغ نظر قلم کاروں نے دوہا نگاری پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ دوہے۔ صدیوں کا سفر کے تحت، ۷ ویں تا ۲۱ ویں صدی تک اہم دوہا نگاروں کا ایک ایک دوہا پیش کیا گیا ہے۔ دوہے کی تعریف میں دوہے کے تحت پانچ دوہا نگاروں کے دوہے شامل ہیں۔ اور آخر میں دوہا نگاروں کی فہرست بھی دی گئی ہے۔ جن کے دوہے کتاب میں شامل ہیں۔ حالانکہ دوہے پر کئی لوگوں نے کام کیا ہے۔ لیکن یہ کتاب تمام پچھلی کتابوں کا عطر ہے۔

ضخامت: ۳۶۰ صفحات ☆ قیمت: ۳۰۰ روپے ☆ سنہ اشاعت: ۲۰۱۱ء

انتخاب دستیاب ہے: ☆ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، اردو بازار، دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶ ☆ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی۔ ۳

مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ۔ ۲۰۲۰۰۲ (یوپی)

مرتب: ڈاکٹر شاہد میر، 54-AB، کوہ فضا، احمد آباد پیلیس، بھوپال۔ ۴۶۲۰۰۱ (ایم پی)

موبائیل: 09893022555

اردو زبان میں ادبی لطائف کی جمع آوری کا سلسلہ خاصہ قدیم ہے۔ لیکن اس کام کو جس محنت لگن، یکسوئی اور جستجو کے ساتھ کے ایل نارنگ ساقی نے متعدد کتابوں میں سمو کر شائع کیا ہے۔ اس کی دوسری مثال نہیں۔ زندگی آمیز اور زندگی آموز لطائف کی کمی نہیں۔ چٹنے چٹخانے والے لطائف کی بھی بہتات ہے۔ اکبر بادشاہ کے عہد میں ملا دو پیازہ اور بیربل کے لطائف کا بھی شہرہ ہوا، لیکن متذکرہ تمام لطائف کا تعلق ادب سے کم اور رواں زندگی سے زیادہ رہا ہے۔ لیکن اردو جہان کے مشہور، مہمان نواز، آں جہانی کنور مہندر سنگھ بیدی کے تربیت یافتہ اردو عالم کے فعال مرکز کا نام

کے۔ ایل۔ نارنگ ساقی

ہے اور انھوں نے ادبی لطائف کی جمع آوری کا کام شوق سے شروع کر کے اسے جنون تک پہنچا دیا۔
ادیبوں کے لطیفے، خوش کلامیاں قلم کاروں کی، ایسی کتابوں میں ادبی لطائف کی یکجائی نے آج کے منتشر ادبی ماحول میں کچھ دیر کو مسکرانے کا سامان مہیا کرنے والے نارنگ ساقی پر ابھی تھکن سوار نہیں ہوئی ہے۔ وہ ابھی تیسری جلد کی بھی تیاریاں کر رہے ہیں۔
اردو جہان کا کون سا ایسا قلم کار ہے جس نے نارنگ ساقی کی مرتب کردہ کتابوں پر خامہ فرسائی نہ کی ہو۔ ادبی رسائل میں تبصرے، مضامین، تمام تر لوازمہ بکھرا ہوا تھا، اس کو سمیٹنے کا اولین کام ماہنامہ شاعر کے گوشۂ نارنگ ساقی میں (نومبر۔۲۰۱۱ء) میں پیش کیا گیا تھا۔ لیکن محدود صفحات میں قد آور مرتب کو اجالنا آسان کام نہیں تھا، لیکن اس دشوار ترین کام کو اردو کے مشہور شاعر، نقاد، مرتب، مصنف ۵۲ کتابوں کے مالک

نذیر فتح پوری

نے احسن طریقے سے انجام دیا ہے، چونکہ وہ سہ ماہی اسباق کے مدیر بھی ہیں اور انھیں اپنی کتابوں کو مرتب کر کے شائع کرنے کا سلیقہ بھی ہے لہذا نارنگ ساقی کی کتابوں پر اردو جہان میں کس نے کیا لکھا، کہاں شائع ہوا۔ سب کو اس طرح جمع کر دیا ہے کہ ایک شخص کے کاروانکاری یکجائی سے کسی ارمغان کا گمان ہوتا ہے۔ کتاب

میخانۂ اُردو کا پیرِ مُغاں

نارنگ ساقی

پر ایسی ضخیم کتاب، ایک بار پھر موضوع بنے گی کیوں کہ ساقی صاحب کا کام ابھی جاری ہے اور نذیر فتح پوری اب بھی تازہ دم ہیں۔ ۱۲۲ مشاہیر نے نارنگ ساقی کے کام کو اپنے اپنے طور پر سراہا ہے۔ اس طرح یہ کتاب حوالہ جاتی بھی ہو گئی ہے۔ ۳۱ یادگار تصاویر کے علاوہ ہر مضمون نگار کے ساتھ نارنگ ساقی کی تصاویر نے مرتبہ کتاب کو محفوظ کر لینے کے قابل بنا دیا ہے۔

ضخامت: ۵۹۵ صفحات ☆ قیمت: چار سو روپے ☆ لائبریری ایڈیشن: ۶۲۵ روپے

ناشر: ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز، ۱۰ میٹروپول مارکیٹ، ۲۵۰۔۲۴۔۲۷ کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۲
رابطہ نارنگ ساقی: 09811580888
ای میل: narangsaqi@gmail.com

راجستھان ایک ایسا صوبہ ہے جس کی زرخیز مٹی نے مشاہیر غزل نگر، ادباء وشعراء افسانہ وناول نگار پیدا کیے ہیں۔ اسی سرزمین سے ایک ایسا نام بھی ابھرا جسے اردو والے کم لیکن ہندی والے زیادہ جانتے ہیں کہ موصوف نے اردو سے زیادہ ہندی زبان کے لئے لکھا۔ شاعر۔ افسانہ ڈرامہ نگار، ناول۔ کالم نگار، بہ یک وقت کئی اصناف میں ان کا قلم تخلیقی جواہر پارے کاغذ بند کرتا رہتا ہے۔ اس فطری قلم کار کا نام

حبیب کیفی

ہے ان کا تعلق رسالہ شاعر سے خاصہ قدیمی رہا ہے۔ شاعری افسانہ بھی کچھ شائع ہوتا رہا ہے۔ مدتوں بعد حبیب کیفی نے اردو میں دو ناول پیش کیے ہیں۔ دونوں ہی ناول ایک ہی سال میں شائع ہوئے ہیں۔

ملامتی

یہ ناول ایک بوڑھے شخص کے گرد گھومتا ہے۔ احسان علی جس طرح اپنی بہو، بیٹے کے درمیان اپنے بڑھاپے کو جی رہا ہے۔ اسی کے تانے بانے اس ناول کی روح میں تخلیقی بیانیہ والے اس ناول میں حبیب کیفی نے اپنی تخلیقی زبان کے ورتالے کا خوب سیرت استعمال کیا ہے۔ ناول دلچسپ ہے، نئی نسل اور خاندان کے بزرگوں کے درمیان کی نفسیاتی جنگ ناول کو ۲۱ویں صدی کا دلچسپ نوحہ بنا دیتی ہے۔

ضخامت: ۱۴۴ صفحات ☆ قیمت: ۱۴۰ روپے ☆ سنہ اشاعت: ۲۰۱۲ء

برادرم حبیب کیفی میں دیگر اوصاف بھی ہیں جو انھیں تجربہ پسند قلم کار کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔ جیسے دو فلمیں، فرینڈس فرسٹ اور چنبل رانی کے منظر نامے اور مکالمے بھی لکھے ہیں۔ ان کے علاوہ شراب گھر اور میں زندہ ہوں۔ عنوان سے دو ڈرامے اسٹیج کیے جا چکے ہیں۔ خاصی تعداد میں ریڈیو ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ اولین ناول صفیہ کو ۱۳ قسطوں میں بطور ریڈیو ناٹک پیش کیا جا چکا ہے۔ اور ڈی ڈی اردو سے ۱۳ قسطوں میں پیش کیا جانے والا ہے۔ ایسا ہمہ جہات لکھاری قلم کار جب معاصر معاشرتی مسائل کو اپنے سوچ کینوس پر تحریر کرتا ہے۔ تو وہ

فٹ پاتھ کی زبانی

عنوان کا ناول خود کو ہر طرح سے مصور کرتا ہے۔ اس ناول میں تخلیقی بیانیہ کے ساتھ قاری کو باندھنے میں کامیاب ہے۔ کسی فلمی کہانی کی طرح قاری کے ذہن کا وسیع اسکرین روشن ہو جاتا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے فٹ پاتھ کی زبانی کسی بھی ہندوستانی زبان میں پہلا ناول ہے۔

ضخامت: ۱۵۶ صفحات ☆ قیمت: ۱۵۰ روپے ☆ سنہ اشاعت: ۲۰۱۲ء

ناشر:

تخلیق کار پبلشرز، لکشمی نگر، دہلی ۔ ۱۱۰۰۹۲

ناول نگار:

حبیب کیفی ۔ ۷۔ لالہ لاجپت رائے کالونی،

پانچویں چوپاسنی روڈ، عیدگاہ، جودھ پور ۔ ۳۴۲۰۰۴ (راجستھان)

موبائل: 09672991292

● اصغر مجیبی کی شاعری بیک وقت خمریاتی بھی ہے اور تمثیلی بھی جو عشق مجازی اور عشق حقیقی کا کیف آگیں امتزاج پیش کرتی ہے۔ اس میں جذبہ فکر کی خسروی بھی ہے اور رموز حیات کی فقیرانہ دروں بینی بھی۔ اشعار میں فنکارانہ تراش و خراش کے ساتھ ساتھ شعور و بصیرت کی تہداریاں بھی ہیں جو زندگی کی مثبت قدروں کا استعارہ ہیں۔ اصغر مجیبی کا شعری سفر ہوا کا ایک تیز خوشگوار جھونکا تھا مگر وقت کی میزان پر شبنم صفت تھا۔ اصولی طور پر کم گوئی و راست گوئی کے قائل تھے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ عظیم آباد کی سرزمین جتنی مردم خیز ہے اتنی ہی مردم خور بھی ہے۔ **(سید شکیل دسنوی)**

● (اصغر حسن مجیبی) اردو اور فارسی دونوں زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کی شاعری میں زبان کی حرمت بھی ہے اور اسلوب میں کلاسیکی رچاؤ کی دلکشی بھی۔ بنیادی طور پر نظم کے شاعر تھے۔ غزلوں میں بھی انفرادی انداز رکھتے تھے۔ زیر نظر شعری مجموعہ "وجدان" سے یہی تاثر ابھرتا ہے کہ شاعری غم جاناں سے غم دوراں تک پہنچنے کا ایک ایسا زینہ ہے جس کے آخری سرے پر کرب ذات، کرب کائنات میں ڈھلتا نظر آتا ہے۔ مختصر یہ کہ ان کی شاعری میں جمالیاتی کیف و کم بھی ہے اور اشاروں کنایوں میں اس دور کی کجروی، حالات کا جبر اور انسانی کرب و احساس کی عکاسی بھی بڑے منفرد انداز میں کی گئی ہے۔ **(سید رحمٰن)**

اصغر حسن مجیبی مرحوم (پ۔ ۱۹۱۲ء ● م: ۱۹۸۶ء) بنیادی طور پر نظم کے شاعر تھے غزل تو صرف وجدان کا ذائقہ بدلنے کے لئے تخلیق کی۔ مجموعے میں صرف ۱۱ غزلیں وہ بھی کم اشعار والی شاعری میں روایتی غزل کی گونج ہے۔

حسن پر جب کبھی شباب آیا ... ماہتاب آیا، آفتاب آیا
اگر یہ اصل حقیقت کے دونوں پہلو ہیں ... تو حسن و عشق کا پھر امتیاز رہنے دے
جانے کو تو شباب جاتا ہے ... کرکے مٹی خراب جاتا ہے

لیکن اس روایتی غزل گوئی میں بھی ہلکی ہلکی چمک، قاری محسوس کرسکتا ہے۔

اجڑی ہوئی دل کی بستی کو مت کہئے یہ ویرانہ ہے ... یہ جوش جنوں کا مسکن ہے اور حسن کا یہ کاشانہ ہے
تری نظر میں فقط نظریات کی دنیا ... مری نگاہ میں ہے واقعات کی دنیا

پابند نظمیہ شاعری میں اقبال کا رنگ، آہنگ جھلکتا ہے اور اصغر حسن مجیبی کو مکمل شعری اظہار کے مواقع بھی مل جاتے ہیں۔

۲۱۔ پابند نظمیں۔ شاعر کے شعری کینوس کی وسعتوں کا پتہ دیتی ہیں۔ نظموں میں کسی خاص بحر کا لحاظ نہ رکھتے ہوئے تجرباتی نظمیں بھی تخلیق کی تھیں۔ ۱۶۔ اشعار کو محیط نظم درس خودی، اقبال کی خودی کا شعری پیغام ہے۔ اس نظم کا آخری بند اقبال کا فلسفۂ خودی کا شعری منشور ہے:

شبنم سی زندگی کیا ... بہتر ہے مر ہی جانا
خود دار ہو جہاں میں ... ہیرے کا جیسے ٹکڑا
خورشید کا ہو پر تو ... سامان خود بقا کا
بن آہ لخت آدم ... الماس کا تو ٹکڑا
ہیرے کا ایک ٹکڑا ... تشبیہ ہے خودی کا

طویل نظم پیمانہ، ۱۴ اشعار پر مشتمل بھی اقبال رنگ ہے۔ تمام نظموں کے مطالعے کے بعد کہا جاسکتا ہے۔ علامہ اقبال کا تتبع کرنے والے اصغر حسن مجیبیؔ علامہ کے معنوی تلامذہ میں سے ایک تھے۔

وجدان

کم عمر شاعر **اصغر حسن مجیبی**

کی ۲۱ نظموں اور ۱۱ غزلوں کا شعری جھرنا

وجدان

ترتیب و پیشکش: **سید شکیل دسنوی**

۲۰ ویں صدی کی نظمیہ شاعری کا چمکتا ہوا "ستارہ" ہے کہ اگر عمر وفا کرتی تو پابند نظمیہ شاعری میں اصغر حسن مجیبی کا نام بھی فہرست میں شامل ہوجاتا۔

ضخامت: ۹۶ صفحات ☆ قیمت: ۱۰۰ روپے ☆ سنہ اشاعت: ۲۰۱۲ء

رابطہ: **سید شکیل دسنوی** سی۔۱۲، سیکٹر۔۶، بیڑاناسی، کٹک۔۷۵۳۰۱۴ (اڑیسہ)

موبائل: 09040963988 فون: 2363672 (0671)

● نعیمہ جعفری کا نسبی تعلق ایک ممتاز علمی اور ادبی خانوادے سے ہے۔ وہ اپنے ورثے کی قدر و قیمت اور اس کی حفاظت کا شعور بھی رکھتی ہیں۔ زبان و بیان کے رموز اور امکانات پر ان کی نظر گہری ہے۔ سب سے اہم بات یہ کہ نعیمہ کو کہانی کے اسلوب اور آہنگ کی تعمیر کا سلیقہ بھی خوب ہے۔ لہٰذا ان سے ہماری توقعات اور تقاضے ختم نہیں ہوئے۔ میری دعا ہے کہ وہ خود مطمئن ہو کر نہ بیٹھ جائیں اور یہ مرحلۂ شوق طے نہ ہو پائے! وہ اپنے آپ کو دریافت کرنے کے عمل سے گزرتی رہیں۔ (شمیم حنفی)

● ادھر ناچیز کو ان کے زیر طبع افسانوی مجموعے 'دھوپ کے ساتوں رنگ' میں شامل افسانوں کے مطالعہ کا موقع ملا تو اندازہ ہوا کہ نعیمہ جعفری پاشا کے افسانے نہ صرف قابل مطالعہ ہیں بلکہ ان کی ادبی قدر و قیمت اور فنی حیثیت کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تکلف نہیں کہ نعیمہ کو فنی دسترس بھی حاصل ہے اور وہ فکشن لکھنے کے تمام آداب سے واقفیت بھی رکھتی ہیں۔ اگر ان کے افسانوں کو غور سے پڑھا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کا مقام ایک اہم افسانہ نگار کی حیثیت سے متعین نہ کیا جا سکے۔ (ابوالکلام قاسمی)

● نعیمہ جعفری کی تیسری کتاب یہ افسانوں کا مجموعہ ہے گویا پاپولر لٹریچر کا حصہ ہے۔ کہانی وافسانوں کا شمار فکشن میں ہوتا ہے لیکن مصنفہ نے اپنے ان افسانوں میں خواب نہیں دکھائے ہیں، بلکہ حقائق کو درشایا ہے۔ 'عرض مصنف' میں انھوں نے کہا ہے کہ "یہ افسانے کچھ واقعات، کچھ حادثات، کچھ جذبات اور کچھ احساسات ہیں، جنھوں نے دل کے تاروں کو چھوا اور نوک قلم تک آگئے۔" اس کتاب میں سب افسانے مختصر مختصر ہیں، لیکن اختصار میں بھی قاری کے دل پر اثر انداز ہوتے ہیں، کیونکہ ان افسانوں میں زندگی کے اتنے دکھ، اتنے درد، اتنی ناکامیاں اور اتنی محرومیاں ہیں کہ بقول مصنفہ لگتا ہے کہ "غم ہی قدر مطلق ہے اور خوشی صرف قدر اضافی ہے۔" (ایس۔ اے۔ رحمن)

● اردو افسانہ جہان کا روشن ستارہ نعیمہ جعفری پاشا کا تعلق ایک مذہبی و ادبی خانوادے سے ہے، چنانچہ موصوفہ نثری اصناف میں اپنی تخلیقی سوچ کا اظہار یہ، کبھی افسانہ تو کبھی تنقید، سوانح، فرہنگ سازی، افسانہ کہانی نعیمہ جعفری پاشا کا نمایاں اسلوب ہے۔ اب تک افسانوں کا ایک مجموعہ ٹوٹا ہوا آدمی شائع ہوا تھا۔ جس کی پذیرائی ہوئی تھی اب نعیمہ صاحبہ معتدر ادبی رسائل کی ضرورت بن گئی ہیں۔ (افتخار امام صدیقی)

مقیم اثر بیاولی

متفرق اشعار

لہو افروز نکہت خیز دہکی شام جاں ہوں
اگر قیمت لگائے شب میں سورج سے گراں ہوں

●

راستوں میں رنج میں یاس میں امید میں
ہم نے زخم کے سوا دوستوں سے کیا لیا

●

خود کو بسانے دریا دریا پھیل گئے ہم
اس نے اس انداز سے رکھی کشتی ہم میں

●

سینکڑوں عالم ذرا سی جان میں رکھتے ہیں ہم
کیسے کیسے رنگ و بو گلدان میں رکھتے ہیں ہم

●

میں فرشتہ نہ آدمی نہ خدا
کون آواز دے رہا ہے مجھے

●

کیا جانے دشتِ امکاں کیا روپ دھارے اب کے
ذرے کی دسترس سے سہما ہوا فلک ہے

●

بحر ایجاد کر اپنی ہی بوند سے
تو بھی ہو بیکراں آئینہ آئینہ

●

پیڑوں کا یہ حال نہیں تھا بارش تجھ سے پہلے
اب کے بادل ایسے برسا ، سایا سوکھ گیا

● مابعد جدید تخلیقیت افروز عالم کے خدوخال کو بنانے، سنوارنے اور نکھارنے اور اس کی گمبھی اور گمبھیری معنویت اور اہمیت کا شدید احساس وعرفان عطا کرنے میں جن سخنوروں نے نمایاں نو اقداری اور نو جمالیاتی کارکردگی کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے ان میں مقیم اثر ایک بڑی کج کلاہ تخلیقیت آفریں، تخلیقیت پرور شخصیت، فکروفن کے مالک ہیں جو اپنے سر میں ایک جداگانہ حسن پرور اور قدر افروز ذہنی خاکہ کے لئے فرسودہ اور مردہ روایت سے احتراز کرتے ہوئے زندہ روایت کی جست گاہ سے زقند بھر کر بے اختیار نئے عہد کی تخلیقیت سے ہمکنار ہوئے ہیں۔

ہے تو مکاں وہی مگر اے چل صرا پانو　　　دیوار، در، دریچے غزل کے بدل گئے

(نظام صدیقی)

اگر میں نے مقیم اثر بیاولی کو شعری جن کہا تھا تو غلط نہیں تھا.

"سرحد لفظ نہیں" سے پہلے

مطبوعہ مجموعے:۱۔لاتخطوا،۲۔نغمۂ سنگ،۳۔بدن بزاد قبا،۴۔طاؤس رنگ،۵۔وحشت در،۶۔رقصِ شرار،۷۔جلوۂ سراب،۸۔شعاعِ درد،۹۔نگارِ دشت،۱۰۔جرسِ گل،۱۱۔غزالِ شوق،۱۲۔شعورِ غم،۱۳۔زخمِ جنوں،۱۴۔رمِ غزل،۱۵۔لمسِ ماورا،۱۶۔آسمان بے زمیں (برائے غالبؔ)،۱۷۔سوچ بے زنجیر (آزاد غزلوں کا مجموعہ)،۱۸۔تیغ خود نگر،۱۹۔خاک خاک سوج،۲۰۔ورق ورق گلاب،۲۱۔شعلہ زار حرف،۲۲۔قطرۂ بحر کشا،۲۳۔لوحِ صحرا،۲۴۔لہو بھی ایک معجزہ،۲۵۔غم آتش خیز،۲۶۔صدائے شہر اجنبی،۲۷۔طوافِ نور،۲۸۔پیراہن خاک،۲۹۔تبسمِ اشک،۳۰۔برق نظر،۳۱۔ریگ آبشار،۳۲۔لودیتی خوشبوئیں،۳۳۔چلچلتی دھوپ بچھراتی چھاؤں۔۳۴۔چاک بے پردہ وجود (تمام آزاد نظمیں)،۳۵۔سلگتے خواب دروازے۔۳۶۔تن تن نئی عریانیاں،۳۷۔شہر جنگل نہ بنے،۳۸۔آگ پر چلتی پیاس،۳۹۔دھوئیں کے پل،۴۰۔بجلیاں بم نہیں پھول برسائیں۔نعتوں کا عظیم مسودہ اور اب شعری حسن

مقیم اثر بیاولی

کا ۴۳ واں شعری مجموعہ

سرحد لفظ نہیں

۲۰۰۶ء میں شائع ہوا تھا ۔ معلوم ہوا ہے کہ مزید شعری مجموعے بازار میں اچھی ، سچی اور اپنی شاعری کے متوالوں کے لئے شائع ہوا چاہتے ہیں .

معاصر عالمی اردو شاعری میں بہت کم نام ایسے ہیں جن پر زود گوئی تمام ہے۔ان کی درجہ بندی کی جائے تو فہرست میں مقیم اثر بیاولی کا شمار نمبر ایک پر ہوگا۔خاکسار کی ۵۰ ہزار سے زائد غزلیں ایک گوشے میں دبک گئی ہیں۔ بے پناہ شعری تخلیقیت والے مقیم اثر کا سوچ کینوس ہر وقت نت نئے خیال شعر بند کرتا رہتا ہے۔

مقیم اثر بیاولی کا تخلیقی سفر ابھی جاری ہے

ضخامت:۵۱۲ صفحات ☆ قیمت: ۵۰۰ روپے ☆ سنہ اشاعت:۲۰۰۶ء

رابطہ:

احتشام حسین، مقیم اثر بیاولی، روم نمبر۔۱۲۶ ایم ایچ پی کالونی، مالیگاؤں۔۴۲۳۲۰۳
موبائل:09823026174

مراسلات کا پتہ: پوسٹ بکس نمبر ۳۷۷۰، گرگام پوسٹ آفس، ممبئی ۴۰۰۰۰۴
ترسیل زر کا پتہ: ۲۲۸/۲۰۲، مینا محل بلڈنگ، پی۔ بی۔ مارگ، ممبئی ۴۰۰۰۰۴

SHAIR MONTHLY, P.O.Box No. 3770, Girgaon, P.O. Mumbai - 400004

فکرامروز

علامہ سیماب اکبرآبادی کی طرحی غزل جو انھوں نے لاہور کے کل ہند مشاعرے میں ۳۰ر نومبر ۱۹۲۵ء کو پڑھی تھی۔ ۱۰ر اشعار کو محیط یہ غزل کلیم عجم ۱۹۳۶ء کے صفحہ نمبر ۲۸۴۔۲۸۵ پر موجود ہے۔

منٹو کا انتقال بھی لاہور میں ہی ہوا تھا۔ اس غزل میں مرحوم کی ذہنی پرندگی کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ گو کہ غزل میں آدمی کے اجتماعی کرب کو درشایا گیا ہے۔ منٹو بھی ذہنی پراگندگی کا شکار تھے انھوں نے شراب نوشی کو اس کا شافی علاج سمجھ لیا تھا۔ لیکن کسی بھی مرض کا مداوا زہر نہیں ہوسکتا۔ (ادارہ)

تاحق شکایتِ غم دنیا کرے کوئی
غم ہے بڑی خوشی جو گوارا کرے کوئی

ہر لمحے کی فنا میں ہے اک زندگی نہاں
کیوں آج ہی سے ماتم فردا کرے کوئی

رگ رگ میں دل کی جذب ہے اک محشر امید
اندازۂ ہجوم، تمنا کرے کوئی

جب ہے خیالِ عشرتِ دنیا فقط فریب
پھر کیوں خیالِ عشرتِ دنیا کرے کوئی؟

ہے اُن کے آستاں پہ ہجومِ غرور و ناز
گنجائشِ جبیں ہو تو سجدا کرے کوئی

ہر شخص ہے خرابِ تمنا بقدرِ ذوق
سیماب کس سے عرضِ تمنا کرے کوئی؟

سیماب اکبرآبادی

فی زمانہ ہندوستانی اردو زبان میں ادبی رسائل کی باڑھ سی آئی ہوئی ہے ہر ماہ کوئی نہ کوئی نیا رسالہ شاعر کے دفتر میں آجاتا ہے۔ بہت کم بلکہ انگلیوں پر گنے جانے والے رسائل ایسے ہیں جو اپنے اولین شمارے سے متوجہ کر لیتے ہیں۔

سہ ماہی ادبی رسائل میں ایک قد آور کتابی سلسلہ

سہ ماہی **آمد** پٹنہ

جس نے اپنے اولین شمارے ہی سے اپنی دھاک جمادی ہے۔ اب ۵ واں شمارہ بھی سابقہ کے معیار کو مزید مستحکم کر رہا ہے۔ کتابی حجم کے رسالے میں قائم ابواب میں مدیر کے تخلیقی ذہن کے غماز ہیں اور رسائل کی بھیڑ میں گم ہوتے ہوئے تھکے ماندے قاری کو تازہ ہوا کا احساس ہوتا ہے اور وہ اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھوں کو بتدریج وا کرتے ہوئے جب شہر مدعا سے شہر خیر و خبر تک آتا ہے تو یک لخت تازہ دم ہو کر رسالے کو مکمل طور پر جذب کرنے کی سعی کرتا ہے۔ ہر قاری کی اپنی نفسیات ہوتی ہے وہ اس کے مطابق تخلیقات اور اپنے پسندیدہ قلم کاروں کا انتخاب کرتا ہے لیکن مکمل رسالہ ہی اس کے ذوق پر حاوی ہو جائے تو وہ اس تذبذب کا بھی شکار ہو جاتا ہے کہ پہلے کیا پڑھے اور کیا بعد میں آمد کی خوب سیرتی ہی قاری کو مکمل رسالے سے باندھ لیتی ہے اور وہ مکمل رسالہ پڑھنے کے بعد بھی خود کو تشنہ محسوس کرتا ہے۔ پھر بار بار پڑھتا ہے، مطالعے کا وقت نکال کر پڑھتا ہے۔ آمد کا کوئی بھی قاری، مفت خوریوں کو رسالہ صرف سرسری جائزہ لینے کے لئے دیتا ہے۔ پڑھنے کے لئے نہیں اور آمد صرف مطالعہ کرنے والا جریدہ نہیں بلکہ اپنے نجی کتب خانے کے معیار کو بلند کرنے کے لئے وہ مفت خوروں کو باہر لے جانے کی اجازت نہیں دیتا۔ جب کسی رسالے میں یہ اوصاف سما جائیں تو اس کا شہرۂ فلک بھر ہو جانا ناگزیر ہے آمد کے مدیر اعزازی

خورشید اکبر

اپنی تیکھی اور بے باکانہ شاعری کی طرح آمد کے لئے تخلیقات کے انتخاب میں سخت گیر معلوم ہوتے ہیں۔ ۱۹۔ ابواب کو محیط شمارہ نمبر ۵ بھی قاری اساس ہے۔ اس شمارے میں ۴۳ قدیم و جدید قلم کاروں کی ایک ادبی کہکشاں سجی ہوئی ہے۔ ان میں سے کچھ اہم نام یوں ہیں۔ انور معظم، شافع قدوائی، مصطفےٰ کریم، رحمٰن عباس، عبدالسمیع، جیلانی بانو، حسن جمال، محمد حامد سراج، طاہرہ اقبال۔

اس خاص شمارے میں دو اہم گوشے بھی دیئے گئے ہیں۔ 'اردو میں جاسوسی ادب کے موجد اور امام ابن صفی، مشہور نقاد اور تاریخ نویس وہاب اشرفی، مذکورہ دونوں گوشے مختصر لیکن جامع ہیں۔ تین صفحات پر مشتمل فہرست کے ابواب میں جو انفرادیت ہے اس کی ایک مثال: جلی عنوان ہے۔ شہر آہنگ۔ اس کے تحت جو مختصر عنوانات ہیں۔ وہ اس طرح دیئے گئے ہیں۔ پیش رو نظمیں، ہم عصر نظمیں، دس خاص نظمیں، سوغات نظمیں۔ شہر خیر و خبر کے تحت ۳۴ خطوط بھی اہم ہیں۔ سرسری یا محض رسید یا چاپلوسی والے نہیں ہیں کہ ان مکتوب نگاروں میں بیشتر کا کتوباتی شہرتوں سے پرے اپنی بات اپنے انداز میں کہنے کا قائل ہے۔

اس شمارے کے تمام مندرجات کو بیان کرنے سے راقم قاصر ہے۔ کچھ آپ بھی تو کیجئے۔ اس ادبی جریدے کو تازہ ترین ہوا کے طور پر اپنے لئے ناگزیر کرتے ہوئے اس کے خریدار بن جائیے۔ جیسا کہ ۵۔ افراد آمد کے تاحیات خریدار بن گئے ہیں۔

تاخیر نہ کیجئے۔ بلکہ شمارہ اولین سے ۵ ویں شمارے تک اور مابعد کے شماروں کے لئے بھی خورشید اکبر سے رابطہ کیجئے۔ شمارہ نمبر ۶ بھی ترتیبی مراحل طے کر رہا ہے۔ اور جنوری ۲۰۱۳ء میں شائع ہو جائے گا۔ خاص نمبر کے آخر میں آمد کے موجودہ شمارے کے قلم کاروں کے انگریزی میں پتے دیئے گئے ہیں۔

ضخامت: ۳۲۰ صفحات ☆ زر تعاون فی شمارہ: ایک سو پچیس روپے (۱۲۵) ۲۰ امریکی ڈالر ☆ زر تعاون سالانہ (چار شمارے) ۶۰۰ روپے (رجسٹرڈ ڈاک سے، ہندوستان میں) ☆ برطانیہ: ۲۰ پاونڈ/امریکہ (و دیگر یوروپی ممالک): ۸۰ امریکی ڈالر ☆ خلیجی ممالک (۶۰ امریکی ڈالر) پاکستان: ۳ ہزار روپے (ہندوستانی) ☆ دیگر ایشیائی ممالک (بیرون ہند): ۳ ہزار روپے (ہندوستانی) خصوصی معاونین: ایک ہزار روپے (سالانہ) ☆ ادارہ جات سے: ایک ہزار روپے (سالانہ) رکن تاحیات: دس ہزار روپے (۱۰،۰۰۰)

جلد: نمبر ۱۔ شمارہ ایک، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۲ء، مدیر: **عطیہ فردوسی**

سرورق: **محمد معراج فیضی عرف مستر**

☆ خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ: آرزو منزل، شیش محل کالونی، عالم گنج، پٹنہ۔ ۸۰۰۰۰۷ (بہار)

ای میل: khurshidakbar@gmail.com

موبائل: 09631629952/07677266932

- سیداولادرسول قدسی، نشاط جاناں اورغم دوراں دونوں کے شاعر ہیں۔ (مظہر امام)
- قدسی نے شاعری میں اپنے تخیلات کونئی سمتیں عطا کی ہیں۔ (حقانی القاسمی)
- میں تروتازہ کواس کے چوکانے والے تیور کی وجہ سے اردو شاعری کے سرمائے میں ایک قابل قدر اضافہ سمجھتا ہوں۔ (کرامت علی کرامت)
- قدسی کی نعتیہ فکر، ستھرا اسلوب بیان رکھتی ہے۔ (ڈاکٹر شہاب ظفر)
- سیداولادرسول قدسی کی شاعری کا قابل ذکر پہلواس کا تاریخی شعور ہے۔ (ڈاکٹر خواجہ اکرام)
- قدسی کی شاعری کاایک نمایاں رنگ ان کی جدت پسندی ہے۔ (ڈاکٹر امجد رضا امجد)
- سیداولادرسول قدسی دینی اورعصری علوم کے ماہر ہیں اس لئے ان کی شاعری دوآتشہ ہوگئی ہے۔ (سید محمد اشرف)

قدسی کی دیگر کتب

نعتیہ مجموعے :انوارقدسی، گلہائے قدسی، گل ولالہ، لب ولہجہ، لوح محفوظ، خدانہ خدا سے جدا

غزلیہ مجموعے: رفتہ رفتہ، تروتازہ، لمحہ لمحہ (**نظمیں**)

لمحہ لمحہ غم عشق رسول میں تروتازہ رہنے والے عاشق

خدانہ خدا سے جدا جیسی پاکیزہ فکرکواپنے مخصوص لب ولہجہ میں رفتہ رفتہ عام کرنے والے فنکار انوارقدسی اور

گلہائے قدسی جیسے مجموعۂ نعت سے ادب کے گل ولالہ کی کاشت کرنے والے شاعر اور

ناعت سرکار ﷺ کی حیثیت سے لوح محفوظ میں جگہ پانے والے مداح رسول

علامہ سید اولاد رسول قدسی

کاایک اورتاریخی کارنامہ

منظوم

سیرت سرور دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم

جلداول

(بعثت سے غزوۂ خندق تک)

صفحات--۶۰۰

بہت جلد منظر عام پر آرہا ہے

ترتیب وتزئین--مولانا محمد رحمت اللہ صدیقی (گولڈ میڈلسٹ)

ناشر-رضادارالمطالعہ پوکھریرا، سیتامڑھی (بہار)

رابطہ کا پتہ:-محمد معین رضا عاکف

نیومہاڈا بلڈنگ ۱۰۸۔روم نمبر۴۰۴، پی ایم جی کالونی، مانخورد ممبئی ۴۰۰۰۴۳

موبائل:09930585533

رابطہ مصنف:

SYED AULADE RASUL QUDSI,

11710,ALGONQUIN,DRIVE 460 APT,HOUSTAN TX 77089 [U.S.A]

شاعر کے منٹو نمبر ۱۹۵۵ء کی مکرر اشاعت کا جواز

افتخار امام صدیقی

منٹو کے انتقال (۱۸ جنوری ۱۹۵۵ء) کے بعد ہندوپاک کے ادبی رسائل نے اپنے اپنے معیار کے مطابق منٹو نمبر شائع کئے تھے۔ ان میں نقوش کے منٹو نمبر کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ شمارہ نمبر ۴۹-۵۰۔ ۱۹۵۵ء اس کے بعد ماہنامہ افکار (کراچی) کا منٹو نمبر تھا جسے صہبا لکھنوی نے مرتب کیا تھا یہ مارچ۔ اپریل ۱۹۵۵ء کا خاص نمبر تھا۔

ہندوستان میں شاعر کو اولیت کا درجہ حاصل تھا کہ اس کا منٹو نمبر مارچ، اپریل ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد ماہنامہ پگڈنڈی کا منٹو نمبر تھا جو اپریل مئی ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے مدیر امریک آنند تھے۔ ۱۹۵۵ء میں ہندوپاک کے کئی ادبی رسائل نے اپنا منٹو نمبر پیش کیا تھا۔

سعادت حسن منٹو کی موت نے ہندوپاک کے ادبی حلقوں پر سوگواری طاری کردی تھی۔ مرحوم کی حیات میں بھی خاصہ کچھ لکھا گیا تھا۔ کتابیں مرتب ہوئی تھیں۔ ان میں جہاں تنقید تھی وہیں منٹو آرٹ کو بھی سراہا گیا تھا۔ منٹو کو پسند کرنے والے کل بھی تھے، آج بھی ہیں اور جب تک اردو افسانہ کہانی میں کوئی غیر معمولی انقلاب رونما نہیں ہوتا منٹو باقی رہے گا۔ حالانکہ قرۃ العین حیدر کا ادبی قد بھی فلک بھر ہے۔ لیکن ان کے موضوعات الگ تھے۔ مرحومہ کی نگاہ ماضی کی تاریخ پر زیادہ تھی۔ آج کے موضوعات کو بھی مرحومہ نے چھوا تھا لیکن جو تنوع منٹو کے پاس تھا وہ بیدی آیا یا عصمت چغتائی کے یہاں نہیں تھا۔

منٹو نہ صرف افسانہ نگار تھا بلکہ اس میں بھی سیاہ حاشیے، منٹو آرٹ کا منفرد تجربہ ہے۔ خاکے، ڈرامے، ناول، تنقید، خطوط، تبصرے، لکھنا، منٹو کی ضرورت تھا اور شراب نوشی اس کی ضرورت اس کی زندگی نشہ کئے بغیر وہ لکھ نہیں سکتا تھا اور لکھے بغیر نشہ ممکن نہیں تھا ایک غیر معمولی لکھاری جو شاید لکھنے ہی کے لئے پیدا کیا گیا تھا اور بے نوشی جس کا مقدر بن گئی تھی۔ خانگی مسائل، تضادات بھری دنیا، منٹو کسی مشین کی طرح حرکت میں رہتا تھا۔ اور اپنی بوجھل سانسوں کو جینے کے لئے، شراب ہی ان کی غذا تھی اور یہی بے نوشی منٹو کی پہچان بن گئی۔

ہندوستان میں رسالہ شاعر کو جو فوقیت منٹو نمبر کی اشاعت کی ہوئی ہے اس کی مکرر اشاعت کا جواز یہ ہے کہ اب یہ نمبر تقریباً کمیاب ہے۔ ہندوپاک کی بڑی لائبریریوں میں شاعر کے فائل موجود ہیں۔ شاعر کے خاص نمبر بھی محفوظ ہیں۔ لیکن شاعر کے وہ قاری جو ۱۹۶۰ء کے بعد شاعر سے وابستہ ہوئے ہیں انھیں منٹو نمبر درکار تھا۔ شاعر کے دفتر میں اس کی ایک ہی کاپی تھی۔

منٹو کا تعلق ہمارے تایا ابو منظر صدیقی ۱۹۷۱ء-۱۹۰۹ء سے دوستانہ تھا۔ منٹو جب بھی آگرہ جاتے تھے۔ منظر صاحب سے ان کے دفتر میں ملاقات ضرور کرتے۔ تایا ابو مصور ماہنامہ کنول شائع کرتے تھے۔ اس میں منٹو کے تراجم شائع ہوتے تھے۔ بالخصوص روسی افسانہ نگاروں میں چیخوف موپاساں بھی منٹو کی پسند تھے۔ اب یہ تو نہیں معلوم کہ منظر صاحب منٹو کو نذرانہ بھی پیش کرتے تھے یا نہیں۔ اسی نسبت سے قبلہ اعجاز صدیقی نے منٹو کے انتقال کے بعد منٹو نمبر کی اشاعت کا اعلان کردیا تھا۔ ۱۰۶ صفحات کو محیط اس خاص نمبر کی قیمت صرف ایک روپیہ تھی۔ ۱۹۵۰ تا ۱۹۵۵ء شاعر ۷۲ صفحات کو محیط شائع ہوتا تھا اور قیمت فی شمارہ ۸ آنے تھی۔

شاعر کے منٹو نمبر کے لئے قبلہ اعجاز صدیقی نے ہندوپاک کے تقریباً تمام مشاہیر کو خطوط لکھے تھے اور یاددہانی بھی کرتے رہے تھے لیکن بعض حضرات نے اپنی دیگر مصروفیات کے سبب مضمون لکھنے سے معذوری ظاہر کی تھی۔ بعض نے اعتراض کیا تھا کہ اتنی جلد منٹو نمبر کیوں شائع کر رہے ہیں۔ بعض نے تو خط کا جواب ہی نہیں دیا تھا۔ لیکن والد صاحب نے دل برداشتہ ہوئے بغیر اعلان کے مطابق منٹو نمبر شائع کیا تھا۔

منٹو نمبر۔۲ کی اشاعت سے قبل منٹو نمبر ۱۹۵۵ء کی مکرر اشاعت یعنی دوسرا ایڈیشن شاعر کے عالمی اردو قارئین کی نذر ہے۔ اس شمارے پر اپنی گرانقدر رائے سے ضرور نوازیئے گا تاکہ منٹو نمبر۔۲۔ اس کی روشنی میں ترتیب دیا جاسکے۔

اکتوبر کے شمارے میں جو اجمال بھر اعلان دیا گیا ہے، اس میں مزید اضافے ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ نمبر اپنی موجودہ ضخامت سے زائد صفحات کو محیط ہو۔

منٹو نمبر کی دونوں جلدیں ان خریداروں کو نہیں ارسال کی جائیں گی جن کی طرف شاعر کے بقایا جات ہیں۔ ایسے قارئین کے نام خطوط روانہ کردیئے گئے ہیں۔

منٹو نمبر۔۲ کے لئے اپنی مطبوعات کے اشتہارات ارسال کیجئے تاکہ رعایتی نرخ پر انھیں مذکورہ خاص نمبر میں شائع کیا جاسکے۔ اکتوبر کا شاعر آپ کو کیسا لگا؟ اپنی گرانقدر رائے سے نوازیئے۔

منٹو کے اندرونی سرورق پر صفحہ تین پر ادارہ کے تحت اعجاز صدیقی۔ مہندر ناتھ اور شکیل الرحمٰن کے نام دیئے گئے ہیں۔

منٹو نمبر ۱۹۵۵ء کی اشاعت کا مکرر جواز یہ بھی ہے کہ ۱۹۵۵ء اور ۲۰۱۲ء کے مابین تنقید میں منٹو شناسی کے تحت کیا فرق آیا ہے۔ منٹو کی وفات کے فوری بعد لکھے گئے مضامین کی آج کیا اہمیت ہے۔ لیتھو پر شائع ہونے والا یہ نمبر ۱۰۶ صفحات پر محیط تھا۔ روشن کتابت وطباعت سے مزین اس شمارے کی اندرونی طباعت یونیورسل پریس گرگاؤں اور سرورق اجمل پریس بمبئی ۳ میں طبع ہوا تھا۔ اس کا سائز 20X27۔8 تھا سرورق دورنگ کا تھا۔ اوپر منٹو نمبر درج تھا اور منٹو کا اسکیچ دیا گیا تھا یہ اسکیچ معاصر ماہنامہ ''افکار'' کراچی سے لیا گیا تھا۔

مکرر اشاعت کے لئے کمپیوٹر پر اس کی کمپوزنگ کی گئی ہے۔ ۱۰۶ صفحات ۶۴ سے کم صفحات میں سما گئے۔ اس کی ترتیب جوں کی توں رکھی گئی ہے۔ صفحات کی کمی کی وجہ سے منٹو کی دو کہانیاں ''سڑک کے کنارے'' ''نیا قانون'' نہیں دی جارہی ہیں۔ یہ دونوں کہانیاں منٹو نمبر دسمبر ۲۰۱۲ء میں دی جائیں گی۔

حق ناقدین کے مضامین منٹو نمبر میں دیے گئے ہیں۔ وہ فوری تاثرات کے باوجود منٹو شناسی کے باب میں اہم ہیں۔

(۱۹ نومبر ۲۰۱۲ء بروز جمعہ ساڑھے تین بجے دوپہر)

شاعر منٹو نمبر مارچ۔ اپریل ۱۹۵۵ء

ترتیب

شاعر کے منٹو نمبر ۱۹۵۵ء کی مکرر اشاعت کا جواز۔ افتخار امام صدیقی ۔۱۲

جرعات

نیند کیوں رات بھر نہیں آتی!

اعجاز صدیقی

منٹو، موت کے معینہ دن پر تو ایمان رکھتا تھا لیکن وہ اپنے آخری نفس تک ''نیند کیوں رات بھر نہیں آتی'' میں الجھتا رہا۔ اس ''کیوں'' کی گتھی کو سلجھاتا رہا اور سلجھاتے سلجھاتے خود ایک سوالیہ نشان بن گیا، اپنے لئے بھی اور دوسرے فنکاروں کے لئے بھی۔ 'یک گونہ بیخودی' کے لئے اس نے دن رات پی۔ اتنی پی کہ ہزاروں بوتلیں خالی ہو گئیں، سیکڑوں جام شکستہ ہو گئے، اس کی وریدوں اور شریانوں میں آگ بھر گئی اور پھر یہ آگ یکا یک اس کے دل تک پہنچ گئی۔

گناہ اور ثواب سوسائٹی کے مسلمات سہی، ان کی تخلیق کے پس پشت کتنا ہی قیمتی مقصد کیوں نہ ہو، اس کے باوجود انسانی سرشت جرم و خطا سے کلی طور پر بچ نہیں سکتی۔ وہ نیکی ہو یا بدی، دونوں میں نیت کو بڑا دخل ہے اور کوئی آخری فیصلہ کرنے سے پہلے ان سے پیدا شدہ نتائج پر ضرور غور کر لینا چاہیے۔ کبھی کبھی گناہ، ثواب اور ثواب، گناہ بن جایا کرتا ہے۔ نیکی، بدی کے سانچوں میں ڈھل جایا کرتی ہے اور بدی، نیکی کے پیمانوں میں۔

وہ گناہ جو لذت کوشی کے لئے اختیار کیا جائے فرد اور جماعت، سوسائٹی اور معاشرہ کے لئے مضرت رساں ہو سکتا ہے، لیکن ایک شے ''گناہ بے لذت'' بھی ہے۔ گو اس سے گناہ کی نفی تو نہیں ہوتی۔ اُس کا جواز پیدا نہیں ہوتا لیکن مآل و اثر کا انداز ضرور بدل جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں عقل و ہوش کو آواز دینی پڑتی ہے۔ بصیرت اور بصارت کو کام میں لانا پڑتا ہے اور کسی آخری فیصلے یا حکم لگانے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ گناہ گار کے ظرف کو جانچنا پڑتا ہے، اسباب و علل اور محرکات پر غور کرنا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی انسان استحصال گناہ کے لئے بھی گناہ اختیار کرتا ہے اور پھر وہ گناہ آگے چل کر گناہ نہیں رہتا بلکہ ایک ''مجبوری'' بن جایا کرتا ہے۔ ''مجبوریوں'' کے لئے ہر قانون میں لچک ہے، وہ اخلاقی قانون و ضابطہ ہوں یا مذہبی۔

منٹو، اردو کا بدنام ترین افسانہ نگار تھا۔ اس کے دو عیب، دو گناہ اور دو جرم بہت واضح اور نمایاں تھے۔ ایک تو یہ کہ وہ کثرت سے شراب پیتا تھا، دوسرے اس کے افسانے عریاں ہوتے تھے۔ شراب یقیناً ایک بُری چیز ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ادیب اور شاعر پیا ہی کرتے ہیں۔ کیا غالب، داغ، فانی، جگر، جوش اور فراق نے نہیں پی، کیا ایرانی شعراء نہیں پیتے تھے۔ مگر یہ خیال و جواب جتنا عمومی اور سطحی ہے اس سے ہم خوب واقف ہیں۔ اس جواب سے نہ منٹو کے گناہ کا رنگ ہلکا ہوتا ہے اور نہ کسی اور کے اختیار کردہ گناہ کا جواز پیدا ہوتا ہے۔

منٹو سے زیادہ نہ کسی نے مے نوشی کی اور نہ اس سے زیادہ عریاں کسی دوسرے نے لکھا، عریانی اور معاملہ بندی کی مثالیں بھی ہمیں اپنے پچھلے ادیبوں اور شاعروں کے یہاں مل جاتی ہیں، لیکن اس شدت اور کثرت سے نہیں جتنی منٹو کے یہاں ملتی ہیں۔ اس کے باوجود بعض لوگ منٹو کو ''معصوم'' سمجھتے ہیں کیوں؟ ایک ''کیوں'' کی فکر و جستجو میں منٹو نے عالم شباب میں اپنی جان دیدی اور اس کی موت کے بعد اب دوسرے ''کیوں'' کے جواب کے لئے ہم سرگرداں ہیں۔

خرق عادات واقعات ہر شخص سے رونما نہیں ہوتے۔ کچھ مخصوص دل و دماغ ہی معجزوں، کرامتوں، اصلاحات، اور انقلاب پیدائی کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کا ترک و اختیار فیشن اور لذت اندوزی کے تحت نہیں ہوتا۔ منٹو کو شراب اس کے فن کے لئے تحریک دیتی تھی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ شراب پی کر دوسری برائیوں کی طرف راغب ہو جاتا تھا، وہ تو صرف پیتا تھا۔ اور ہر وقت لکھتا تھا۔ اگر وہ شراب نہ پیتا تو قطعیت کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ وہ اتنے زیادہ اچھے افسانے اردو کو نہیں دے سکتا تھا وہ تو ہر وقت ایک بیخودی اور سرشاری چاہتا تھا اور یہ بیخودی اُس پر سماج اور سوسائٹی کے اسرار و رموز منکشف کرتی تھی، وہ یکسو ہو جایا کرتا تھا، جب تک اس پر کیف و سرور کا عالم طاری رہتا، اس کا قلم چلا کرتا، وہ اپنی کہانیوں کے ماحول میں ڈوب جایا کرتا، اُن میں کھو جاتا اور ٹوٹنے لگتا تو ہر طرف سے غم دوراں کے تیر اس پر چلنے لگتے، وہ ان تیروں کی زد سے اپنے فن اور اپنے دل و دماغ کو بچانا چاہتا تھا۔ شراب کے علاوہ اس کے پاس کوئی ڈھال اور کوئی فسانے نہیں لکھتا تھا بلکہ صحیح معنوں میں ادبی مزدوری کیا کرتا تھا۔ روزانہ دو تین افسانے لکھنا کوئی آسان کام نہیں۔ اگر مغربی فن کاروں کی طرح اسے بھی آسائشیں میسر ہوتیں تو وہ صرف چار کہانیاں لکھتا، اس کے پاس ایک وسیع بنگلہ ہوتا۔ باغ ہوتا، اس کی اپنی کار ہوتی، نوکر چاکر ہوتے اور یقیناً پھر وہ اس کثرت سے شراب نہ پیتا جس کثرت سے اس نے پی، لیکن اس نے جتنی زیادہ شراب پی، اُس کا فن اتنا ہی نکھرا اور سنورا۔ اُس نے اپنی آخری زندگی میں کئی بہترین افسانے اور ڈرامے لکھے، اُس کے خیالات میں ہمہ گیری اور بلا کا تنوع پیدا ہو گیا تھا، اُس نے پچھلے چند سال میں لازوال کہانیاں تخلیق کیں جو نئے معاشرتی شعور اور نئے نقطۂ نگاہ سے بھرپور ہیں۔ اُس نے اپنے افسانوں میں جو کردار پیش کئے وہ ہمیں موجودہ سماج اور ماحول میں قدم قدم پر مل جاتے ہیں۔ اس نے سماج کی گھناؤنی تصویریں پوری دیانت اور ذمہ داری کے ساتھ بغیر کسی مبالغہ آرائی کے پیش کر دیں۔ اُس نے اپنی کہانیوں کو سنسنی خیز نہیں بنایا، عریانی کے باوجود اُس کے فن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ فحاشی پر نہیں اُکساتا۔ اُس کی بہت سی کہانیاں مغرب کے مشہور و ممتاز ادیبوں کے مقابلہ میں رکھی جا سکتی ہیں۔ اس مقابلہ میں بھی اُس کا انداز تحریر منفرد ہی رہے گا، اگر وہ شراب محض لذت نفس کے لئے پیتا تو وہ نہ اتنا بڑا فن کار ہوتا اور نہ ایسے لافانی شہ پارے دے سکتا تھا۔ اُسے تو شراب پی کر طوائفوں کے کوٹھوں پر ہونا چاہیے تھا، جوا کھیلنا چاہیے تھا۔ تفریح کرنی چاہیے تھی، خوب صورت عورتوں کو تاکنا چاہیے تھا۔ لوگوں کو فریب دینا چاہیے تھا لیکن اُس نے ان میں سے کچھ بھی نہیں کیا۔ اُس نے صرف افسانے لکھے، دن اور رات۔ افسانوں کو نئی تکنیک دی اور انوکھے کردار۔ جو لوگ اُس کے عریاں افسانے پڑھ کر اپنے خیالات کو گندگی اور فحاشی کے قریب لاتے ہیں یہ اُن کا اپنا قصور ہے، اپنے ظرف کی خامی اور اخلاق کی پستی ہے۔ منٹو کی عریانی کا نہ یہ مقصد ہے اور نہ صحت مند ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے۔

منٹو ایک منفرد شخصیت کا مالک تھا، اپنی انفرادیت کو قائم کرنے اور اپنی منزل پر جلد پہنچ جانے کے لئے وہ بڑا بے چین اور مضطرب رہتا تھا، وہ بہت تیز دوڑا، اُسے اندیشہ تھا کہ عمر رواں کہیں اُس کا ساتھ نہ چھوڑ دے۔ اگر وہ اتنا تیز نہ دوڑتا اپنے فن میں اس درجہ ڈوب نہ جاتا اور خود پر اتنی گہری بیخودی طاری نہ کر لیتا تو آج وہ اردو کا جلیل القدر افسانہ نگار نہ ہوتا۔ صرف کسی فلم کمپنی کا کہانی نگار یا ریڈیو اسٹیشن کا قلم کار ہوتا۔ اُس میں فن کارانہ غرور پیدا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ نہ وہ دوسرے فن کاروں کے لئے سوالیہ نشان بنتا اور نہ اُس کی موت کے بعد اعجاز صدیقی اور دوسرے ایڑیاں رگڑتے ہوئے اردو کے سچے خدمت گزاروں کو

''نیند کیوں رات بھر نہیں آتی۔''

مزید شدت کے ساتھ غور کرنے کا موقع ملتا۔ ●

شاہ ضیا مہر

باغی فسانہ گو

کون کہتا ہے کہ اے دل رو نہیں
وہ نڈر ، باغی فسانہ گو نہیں
روح افسانوں میں جس نے پھونک دی
وہ ادیب جانفزا ، خوشگو نہیں
راستہ سنسان ، منزل محوِ یاس
راہبر بھی تھا جو ، وہ خود رو نہیں
انقلاب عہدِ حاضر کا نقیب
کہدیا اس نے تھا کہنا جو نہیں
موت نے آزاد اُس کو کر دیا
تھا کبھی مجبور وہ اب تو نہیں
اک خلا معمورۂ عالم میں ہے
دردِ دل کا حال کچھ پوچھو نہیں
وقت یہ آتا ہے سب پر ایک دن
ہوش اے اردو تو اپنے کھو نہیں
نوعِ انساں بے سعادت ہوگئی
محفلِ ہستی میں اب منٹو نہیں
دل کے ہاتھوں اے ضیا مجبور ہوں
لطف اظہارِ الم میں گو نہیں

نامی انصاری

مرگ منٹو

شاخِ گل ٹوٹ گئی ، موجِ صبا رقصاں ہے
خوب ہے اہلِ چمن ، بزمِ چمن کا آئین
مرگِ منٹو سے یہاں رُوحِ ادب نوحہ کناں
چرخ پر محوِ تبسم ہے مشیت کی جبیں
اک ستارہ کہ حوادث نے جسے پالا تھا
گردشِ چرخ سے تنویرِ جہاں بن نہ سکا
اک مفکر کہ بدلنا تھا جسے نظمِ چمن
خوبیٔ وقت سے شمشیرِ گراں بن نہ سکا
ہائے وہ رند، کہ دانائے مئے و مینا تھا
راس آئی نہ خرابات کی شوریدہ سری
ہائے وہ مرد ، کہ یکتائے غمِ دوراں تھا
کھا گئی چشمِ زمانہ کی '' وسیع النظری''
آفریں اُس پہ کہ رسوائے جہاں بھی ہوکر
چاک کرتا ہی رہا ، پردۂ اسرارِ حیات
اس پہ تحسین ، کہ با حالِ پریشاں طبعی !
عمر بھر بنتا رہا رونقِ ہر دارِ حیات
زندگی آج اگر اس سے گریزاں ہے تو کیا
زندگی اس کے افسانوں میں ہے رقصاں جولاں
شاخِ گُل ٹوٹ گئی ، بزمِ چمن قائم ہے
''کون ہوتا ہے حریفِ مئے آلامِ جہاں''

پریم وار برٹنی

منٹو

ٹوٹ کر ایک پُر نور تارا معاً
شب کے تاریک ماحول میں کھو گیا
ایک فنکار! علم و ادب کا امیں
یک بیک موت کی گود میں سوگیا

—

ساز لینے لگے غم بھری ہچکیاں
گھل گئی گیت کی لے میں افسردگی
دیکھ کر خوف سے آسماں کی طرف
رو پڑی مسکراتی ہوئی زندگی

—

ایک فن کار کی موت کے ذکر سے
دل تڑپنے لگے زخم کھائے ہوئے
بزم علم و ادب پر خزاں چھا گئی
رک گئے جام ہونٹوں تک آئے ہوئے

—

زندگی کے افق سے اُبھرتا ہوا
کچھ اندھیرا سا محسوس ہونے لگا
غم بھرے حادثوں کے بھنور میں کوئی
دل کا نازک سفینہ ڈبونے لگا

—

رک گیا وقت کا تیز رَو کارواں
ہوگئی گم فضا میں صدائے جرس
چند لمحے سسکتی رہی خامشی
فرطِ غم سے ہراساں ہوا ہر نفس

—

کیا کیا ہے ستمگر فلک نے ستم
کس طرح کر سکے کوئی اظہار غم
اشک بہتے نہیں درد تھمتا نہیں
کانپتے ہاتھ میں رُک رہا ہے قلم

وارث حسین علوی

منٹو کی افسانہ نگاری

عزیز احمد نے منٹو پر لکھتے ہوئے کہا تھا کہ ان کے افسانوں کی ''دلچسپی کا بڑا سبب ان کی تکنک ہے۔ افسانوں کا انجام غیر متوقع ہوتا ہے اور ناظر افسانہ ختم کر کے تعجب میں کھو سا جاتا ہے۔'' اس تکنک کو منٹو نے زندگی بھر اپنایا ہے ''آلو کا پٹھا'' سے لے کر ''حسن کی تخلیق'' تک اسی تکنک کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ منٹو کے اکثر افسانوں کی کامیابی کا راز اسی تکنک کی خوش اسلوبی اور فن کارانہ سلیقہ سے استعمال کرنے میں مضمر ہے لیکن یہ کہنا شاید صحیح نہ ہو کہ اس تکنک نے اس سے ہمیشہ کامیاب افسانے لکھوائے۔ تکنک تو بہر صورت مواد کو پیش کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ تکنک اور مواد کا رشتہ فن کار کے نزدیک ضدین کی حیثیت نہیں رکھتا۔ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ فن کار تکنک کو اہمیت ضرور دیتا ہے لیکن مواد پر فوقیت نہیں دیتا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس صورت میں ہیئت پرستی اور شعبدہ بازی کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اعلیٰ فن پاروں کی تخلیق مواد اور تکنک کی خوشگوار ہم آہنگی کی مرہون منت ہے۔ اسی لئے منٹو نے تکنک کو افسانوی مواد سے علاحدہ کر کے کبھی نہیں برتا۔ منٹو کے کامیاب افسانوں کے مطالعہ کے دوران میں جو چیز ہمیں زیادہ متاثر کرتی ہے وہ تکنک کا کوئی انوکھا تجربہ نہیں ہوتا مثلاً ''کھول دو'' اس لئے کامیاب افسانہ نہیں ہے کہ اس کا انجام غیر متوقع یا استعجاب انگیز ہے۔ ویسے تو آم۔ غسل خانہ۔ یزید۔ ہرنام کور بدتمیز، سبھی کا انجام غیر متوقع ہے لیکن یہ افسانے 'کھول دو' کی بلندی اور عظمت کو نہیں پہنچتے۔ 'کھول دو' کا مواد بذات خود فکر انگیز اور المناک ہے۔ افسانہ ختم کرنے کے بعد ہم کھو تو ضرور جاتے ہیں لیکن ہمارا کھونا کچھ پانے کے لئے ہوتا ہے۔ افسانہ ختم کرنے کے بعد ہم پر صرف گمشدگی کی کیفیت طاری نہیں ہوتی بلکہ تخیل ایک جھٹکا کھا کر افسانہ کی خالی جگہوں کو پُر کرنا شروع کر دیتا ہے اور ان واقعات کا کھوج لگاتا ہے جو افسانہ میں بیان نہیں کیے گئے۔ لیکن جن کی طرف افسانہ کا اختتامیہ اشارہ کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ افسانہ کے اس مواد کو اسی صورت میں کامیابی سے پیش کیا جا سکتا تھا لیکن افسانہ پڑھ کر فوری اثر جو ہم پر ہوتا ہے وہ تکنک کے انوکھے تجربہ یا فن کار کی چابکدستی کا نہیں ہوتا بلکہ ہمیں وہ حقیقت نگاری اور ایسی صورت حال متاثر کرتی ہے جس کو سپرد قلم کرنا منٹو کے پیش نظر تھا۔ افسانہ کے اختتام سے منٹو نے تازیانہ کا کام لیا ہے جس کی ایک ہی ضرب کھا کر ہمارا تخیل پیچھے کی طرف دوڑنے لگتا ہے اور ایک ایک کر کے ان تمام وحشیانہ مظالم کی تصویر کھینچ دیتا ہے جو سکینہ پر گزارے گئے تھے۔ افسانہ کا انجام مواد کے ساتھ ہم آہنگ ہے اور افسانہ فطری طور پر ارتقائی منازل طے کرتا ہوا نقطۂ عروج پر پہنچتا ہے۔

تکنک منٹو کے یہاں ہیئت ضرور رکھتی ہے لیکن منٹو کی عظمت کا راز تکنک کے تجربوں میں نہیں بلکہ اس مواد میں ہے جو براہ راست اس نے زندگی سے حاصل کیا تھا اور جسے اس نے بے کم و کاست نہایت حقیقت پسندانہ طور پر اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ تکنک منٹو کے ہاتھ میں ایک ایسے آلہ کی حیثیت رکھتی ہے جس کی مدد سے وہ افسانہ کے خام مواد کو جو اس نے ذاتی تجربات اور مشاہدات کے ذریعہ حاصل کیا تھا، تراشے ہوئے ہیروں میں بدل دیتا ہے۔ عام طور پر یہی سمجھنے میں آتا ہے کہ منٹو اپنے مواد کو من و عن پیش کر دیتا ہے۔ جو جی میں آتا ہے لکھ دیتا ہے۔ تنقید، احتساب اور چھان بین سے کام نہیں لیتا۔ لیکن خود منٹو نے دھواں۔ ٹھنڈا گوشت۔ کالی شلوار اور ہتک کا جس بالغ نظری اور ژرف نگاہی سے تجزیہ کیا ہے وہ بذات خود اس بات کی دلیل ہے کہ منٹو ہر جملے، ہر جزو، ہر تفصیل مکمل غور و فکر اور ادبی ذمہ داری کے ساتھ لکھتا ہے۔ تراش خراش اور کتر بیونت کے ذریعہ افسانوں کو تمام غیر ضروری آلائشوں سے پاک رکھتا ہے۔ گو منٹو نے بیشتر افسانے ایک ہی نشست میں اور اکثر اوقات قلم برداشتہ لکھے ہیں اور شاید ان پر نظر ثانی بھی نہیں کی لیکن قطع و برید کا عمل افسانہ کی تخلیق ہی کے دوران میں اپنا کام کرتا جاتا ہے۔ منٹو نے افسانہ نگاری میں اس قدر مشق بہم پہنچائی تھی کہ معلوم ہوتا تھا گویا گڑھا گڑھایا افسانہ بغیر کسی کاوش کے صفحۂ قرطاس پر منتقل ہو رہا ہے۔ چنانچہ منٹو نے افسانوی تکنک کے بارے میں بہت کم سوچا اور محض تکنک کے تجربہ کے طور پر تو اس نے شاذ ہی کوئی افسانہ لکھا۔ ممکن ہے آپ ''پھندنے'' ''بڑھے کھڑ'' وغیرہ کی مثال پیش کریں۔ پھندنے تکنک کا نہیں مواد کا تجربہ ہے۔ تکنک تو وہی پرانی ہے البتہ مواد ایک خاص نوعیت کا حامل ہے، بڑھے کھڑ میں بھی مرکز توجہ تکنک سے کہیں زیادہ زکیا کا کردار ہے۔

منٹو کے اکثر افسانوں میں غیر متوقع اور بعض اوقات تحیر خیز انجام کو دیکھ کر بھی عام طور پر یہی محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ تکنک کے تجربہ کے طور پر لکھا گیا ہے اور افسانہ کی کامیابی کا تمام دارومدار اس کے انجام پر ہے۔ لیکن اگر منٹو افسانہ کی دوسری جزئیات کو نظر انداز کر کے افسانہ کو حیرت انگیز بنانے کی کوشش کرتا اور افسانہ کی تمام تر دلچسپی کا انحصار افسانہ کے اختتام پر ہوتا تو نہ تو وہ اتنا بڑا فن کار تسلیم کیا جاتا نہ ہی اس کے افسانے ادب کے اعلیٰ نمونوں کی حیثیت اختیار کر سکتے۔ اس کی حیثیت ادب کے ایک نٹ سے زیادہ نہ ہوتی جو کہانی کے رسّے پر پھدک پھدک کر عجیب و غریب کرتب دکھا رہا ہو۔

منٹو کے افسانوں (میرا مطلب کامیاب افسانوں سے ہے) کا انجام فی الحقیقت ایک عروجی نقطہ پر ہوتا ہے جہاں پہنچ کر افسانہ کی شدت تاثر میں ایک نمایاں اضافہ ہو جاتا ہے اور افسانہ فن کی انتہائی سرحدوں کو چھو لیتا ہے۔ بہت سے افسانے جن میں منٹو اور او ہنری کے جس نے استعجاب انگیز اختتام کی تکنک کو کامیابی سے برتا ہے افسانے بھی شامل ہیں محض اس لئے اعلیٰ ادبی تخلیقات نہ بن سکے کہ ان میں زیادہ تر توجہ پلاٹ کو ایک خاص منصوبہ کے تحت اختتام تک پہنچانے پر مرکوز رہتی ہے۔ اور واقعات، کردار اور حقائق ثانوی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس قسم کی کہانیاں افسانوں کے بجائے حکایتوں سے زیادہ مماثلت رکھتی ہیں۔ کرشن چندر کا افسانہ ''پھول سرخ ہیں'' احمد عباس کا ''چڑچڑے کی کہانی'' وغیرہ اسی لئے ناکام ہے ہیں کہ پلاٹ کو غیر متوقع موڑ دیا گیا ہے لیکن افسانہ جزئیات میں کمزور ہے۔ چڑچڑے کی کہانی ایک تمثیلچہ ہے لیکن صحافتی قسم کا۔ منٹو نے بھی مختصر تمثیلچے لکھے ہیں ''شیر آیا شیر آیا'' اور ''کرامات'' ''تیجم'' استعجاب انگیز اختتام کے لحاظ سے بہت ہی کامیاب ہیں۔

افسانے کے انجام کو ہمیشہ غیر متوقع بنانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ افسانہ اپنے فطری ارتقا کو چھوڑ کر پہلے سے متعین کردہ گڑھے گڑھائے راستہ پر چل نکلتا ہے۔ واقعات بھی اسی مناسبت سے لائے جاتے ہیں۔ افسانہ نگار پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے کہ مبادا انجام کے متعلق قاری کو پہلے ہی سے کچھ اشارے نہ مل جائیں۔ افسانہ ایک بند مٹھی کے مانند ہوتا ہے جس کے کھلنے کا ہم بڑی بے چینی سے انتظار کرتے رہتے ہیں۔ تحیر کے اس طریقہ سے بڑا ادب مشکل سے پیدا ہوتا ہے۔ شعبدہ بازی فن کی جگہ لے لیتی ہے۔ نو مشق فن کاروں میں تحیر اور استعجاب انگیزی کے یہ کرتب مشق فن کے طور پر روا رکھے جاسکتے ہیں لیکن باشعور اور پختہ مغز فن کاروں سے ہم ایسی تخلیقات کی توقع رکھتے ہیں جو فکر انگیز اور حیات افروز ہوں۔ زندگی کے اسرار و رموز کی عقدہ کشائی کریں اور نئی قدروں، نئی حقیقتوں اور زندگی کے اہم تجربات سے ہمیں روشناس کرائیں۔ لیکن جب منٹو ''پھندنے''''' آنکھیں''''' حسن کی تخلیق'' اور ''یزید'' وغیرہ لکھتا ہے تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ منٹو ہمیں کوئی حیران کن بات کہہ کر چونکانا چاہتا ہے۔ یزید میں افسانہ کے صرف ایک جملہ سے جو کافی جذباتی ہے تمام افسانہ میں روح پھونکنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ کوشش کامیاب نہیں ہوتی۔ پھندنے کے اختتامیہ میں بھی برجستگی کے بجائے صاف تکلف نظر آتا ہے۔ ''آنکھیں'' میں قدم قدم پر احساس ہوتا ہے کہ لڑکی اندھی ہے۔ لیکن اس کا انکشاف افسانہ کے اختتام تک ملتوی رکھا جاتا ہے۔ اس قسم کے افسانوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اگر ایک مرتبہ بھی افسانہ کے انجام کے متعلق پتہ چل گیا یا کچھ اشارے مل گئے تو پھر افسانہ سانپ کے منہ کی چھچھوندر بن کر رہ جاتا ہے۔ پھول، دو نعرہ، خوبھابائی، لائسنس، عشق حقیقی، محمودہ، عزت کے لئے، ہرنام کور اور اس قسم کے بے شمار افسانے ہیں جو اس تکنک کے کامیاب نمونے ہیں۔ ان افسانوں کا انجام بھی تعجب خیز ہے تو کبھی حیران کن، کبھی غیر متوقع تو کبھی المناک۔ ''عزت کے لئے'' میں افسانہ انجام پر پہنچ کر ایک زبردست طنزیہ صورت حال میں بدل جاتا ہے۔ وہ شخص جس نے دوسروں کی عزت کے لئے اتنا کچھ کیا مرنے کے بعد اس کی عزت نہایت ہی بدنما داغ سے ملوث ہو جاتی ہے۔ محمودہ اور خوبھابائی کا انجام اتنا غیر متوقع نہیں جتنا کہ دردناک ہے۔ ۱۹۱۹ء کی ایک بات کا انجام طنزیہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کرب لئے ہوئے ہے۔ ہرنام کور کا انجام حیرت انگیز ہے۔ لیکن افسانہ کی نفسیاتی اٹھان کے ساتھ ہم آہنگ بھی ہے۔ ان افسانوں کا ارتقاء کچھ اس ڈھنگ سے ہوتا ہے کہ افسانہ کے واقعات ایک مخصوص انجام کی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ کہانی آہستہ آہستہ بڑھتی مختلف مراحل طے کرتی پھیلتی سکڑتی نقطۂ عروج پر پہنچتی ہے۔ ان افسانوں کی خوبی ان کے انجام میں ہی پوشیدہ نہیں بلکہ اپنی حقیقت نگاری، نفسیاتی مطالعہ اور کردار نگاری کے لئے نقطۂ نظر سے بھی یہ افسانے کامیاب اور اہم ہیں اور مطالعہ کے دوران میں جس طرح واقعات ترتیب و تناسب سے ابھرتے جاتے ہیں کردار تشکیل پاتے جاتے ہیں اور انوکھے تجربات اور ڈھکی چھپی حقیقتوں کا انکشاف ہوتا جاتا ہے، وہ ہمیں انجام سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

۱۹۴۷ء کے بعد منٹو نے جو افسانے لکھے ہیں وہ اس کے پہلے کے افسانوں سے مختلف ہیں۔ ''خالی بوتلیں خالی ڈبے'' کے پیش لفظ میں منٹو نے لکھا ہے۔ ''یہ افسانے میرے پہلے کے افسانوں سے کسی قدر مختلف ہوں گے۔ ان میں الفاظ بقدر کفایت استعمال کیے گئے ہیں۔ فروعی تفصیلات سے پرہیز کیا گیا ہے۔ یہ امر ملحوظ خاطر رہا ہے کہ کم سے کم الفاظ میں حرف مدعا بیان ہو جائے۔'' چنانچہ منٹو کے بعد کے افسانوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ کہانی نہایت سیدھے سادے طریقہ سے بیان کی گئی ہے۔ روداد میں کوئی پیچ و خم نہیں ہے واقعات کا انتخاب سختی سے کیا گیا ہے اور کہانی کی وحدت اور مرکزیت کو کسی طرح مجروح ہونے نہیں دیا۔ اسی تکنک کا استعمال کیا گیا ہے جس میں جزئیات نگاری اور تفصیلات کی گنجائش نہ ہو کہانی میں description کی جگہ narration سے کام لیا جاتا ہے۔ مختلف کردار افسانہ نگار کو مخاطب کر کے کہانی بیان کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب کہانی افسانہ نگار کو مخاطب کر کے بیان کی جائے تو نفس مضمون سے بھٹکنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی ۔۔۔۔۔۔۔ اگر ایسا ہو بھی تو افسانہ نگار روک ٹوک کرنے غلط بیانیوں کا احتساب اور الجھی ہوئی باتوں کا حل طلب کرنے کے لئے موجود ہوتا ہے۔ ماپاساں کے اکثر افسانے اسی نوعیت کے حامل ہیں ان افسانوں کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ افسانہ نگار افسانہ سے علاحدہ نہیں رہتا بلکہ وہ بھی افراد افسانہ میں شامل ہوتا ہے۔ وہ واقعات کو رونما ہوتے دیکھتا ہے۔ مختلف کرداروں سے ملتا ہے وہ تمام واقعات کے گزر جانے کے بعد انھیں سمیٹ کر بحیثیت افسانہ نگار بیان نہیں کرتا لیکن جیسے جیسے واقعات گزرتے جاتے ہیں کردار سامنے آتے جاتے ہیں وہ انھیں بیان کرتا جاتا ہے۔ جیسے تقی کاتب، بابو گوپی ناتھ، ممی یا ممد بھائی ہیں۔ ان افسانوں میں کوئی گنجلک، ژولیدگی یا پریشاں بیانی نہیں ملتی۔ ان میں وہ نکھری ہوئی کیفیت، صفائی اور عریاں سادگی naked simplicity ہے جو عظیم آرٹ کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ ان افسانوں کے مکالمات میں بھی وہی برجستگی اور شستہ پن ہے جو کم افسانہ نگاروں کے حصہ میں آیا ہے۔ مکالمے عام بول چال کی زبان میں ہیں اور کرداروں کی شخصیت، ان کی سماجی حیثیت اور نفسیاتی ساخت کے مطابق ان کے لب و لہجہ کا خاص خیال رکھا گیا ہے جس سے مکالموں میں واقعیت کا رنگ کافی نکھر آیا ہے۔ بادشاہت کا خاتمہ، چور، ابجی ڈڈو شاردا وغیرہ ایسے بے شمار افسانے ہیں جن میں مکالمہ نویسی اپنی معراج پر ہے اور زبان کی نفاست، ہلکا پھلکا مزاح، بذلہ سنجی اور طنزیہ جملوں نے ان میں وہ قابل رشک رعنائی پیدا کر دی ہے جس کی مثال عصمت اور بلونت سنگھ کے علاوہ بہت کم افسانہ نگاروں میں ملتی ہے۔ منٹو بنیادی طور پر مزاح نگار نہیں ہے لیکن اس کی مزاحیہ حس کافی تیز ہے۔ شستہ اور شائستہ ہے منٹو نے کم افسانے ایسے لکھے ہیں جو بنیادی طور پر مزاحیہ ہوں۔ مثلاً منتر، الو کا پٹھا، جھوٹی کہانی وغیرہ۔ اس کی مزاح نگاری کا اصل جوہر اس کے مضامین میں کھلتا ہے۔ اس کے افسانوں میں مزاح کی لطیف کیفیت چھائی ہوئی ہوتی ہے اور مزاح کا رنگ کبھی اتنا گہرا نہیں ہوتا کہ تصویر کے اصل خد و خال دھندلے پڑ جائیں۔ یہی حال منٹو کے طنز کا ہے۔ براہ راست اور زہر آلود طنز کی مثالیں اس کے مضامین اور خصوصاً وہ مضامین جو اس نے اپنے افسانوں کی مدافعت میں لکھے ہیں۔ ملتی ہیں۔ افسانہ میں طنز براہ راست نہیں ہوتا۔ طنزیہ جملے اس طرح بکھرے ہوئے نہیں ہوتے کہ انھیں چن لیا جائے۔ براہ راست طنز افسانہ نگار کے بجائے مضمون نگار کو زیادہ زیب دیتا ہے۔ افسانہ میں طنز طنزیہ صورت حال سے خودرو پودے کی مانند پھوٹ نکلتا ہے۔ ارسکائن کاڈویل کے ہاں اور برنارڈ شا کے بعض ڈراموں میں طنزیہ صورت حال irronicat situation کی چند خوب صورت مثالیں نظر آتی ہیں۔ منٹو نہایت سلیقہ مندی اور نہایت فن کارانہ چابک دستی سے طنز کا نشتر چلاتا ہے۔ ہم سنبھلنے بھی نہیں پاتے کہ طنز اپنا کام کر جاتا ہے اور منٹو کا نشتر ایک مرتبہ چل جائے تو اس کی خلش مدتوں ہمیں بے چین رکھتی ہے۔

منٹو کے افسانوں کا مادی رجحان جنس ہے جس کے لئے اسے کافی مطعون کیا گیا ہے۔ اس موقع پر ان بزرگوں کا تو ذکر ہی بے کار ہے جو ادب کے باغ میں اس شجر ممنوعہ کی نشو و نما سرے سے پسند ہی نہیں کرتے۔ ان کی مخالفت کی بنیاد فکری گہرائی اور شعور کی پختگی کے بجائے ادب اور آرٹ کی پاکیزگی کے متعلق چند غلط قسم کے تصورات اور فرسودہ اخلاقی قدروں سے جذباتی وابستگی پر قائم ہے۔

۔۔۔ منٹو نے ان کے مخالفانہ اور مخاصمانہ حملوں کی کوئی پروا نہیں کی۔ اگر کوئی پختہ مغز اور باشعور نقاد اس کے افسانوں کا تجزیہ کرتا، اس کی خامیوں اور لغزشوں کی گرفت کرتا تو منٹو کو کوئی

اعتراض نہیں تھا، خود ممتاز حسین کو اس بات کا اعتراف ہے کہ "منٹو اپنے عیوب جاننے میں بہت دلیر ہے"۔ منٹو کو غصہ تھا تو صرف اس بات پر کہ ادبی تنقید جو بہت ہی اہم فکری مشغلہ ہے الزام تراشی، دشنام بازی اور جارحانہ حملوں کی شکل اختیار کر کے بلند مقام کو کھو بیٹھی تھی۔ تنقید کا فن ان لوگوں کے ہاتھ میں چلا گیا تھا جو اس کے اہل نہیں تھے۔ وہ کس قدر تلخی سے کہتا ہے "کسی ادب پارے کے متعلق روزانہ اخبار کے ایڈیٹر، ایک اشتہار فراہم کرنے والے منیجر اور ایک سرکاری مترجم کا فیصلہ صائب نہیں ہوسکتا۔ کسی بڑے شاعر کسی بڑے افسانہ نگار پر صرف وہی آدمی تنقید کرسکتا ہے جو تنقید نگاری کے فن کے تمام عواقب و مواطف سے آگاہ ہو۔"

منٹو فن کار تھا۔ اسے ادب کی عظمت کا احساس تھا۔ فن کار کی ذمہ داری کا شعور تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے افسانے مخرب اخلاق یا فحش نہیں۔ وہ افسانے بچوں کے لئے اور تلذذ پسند نوجوانوں کے لئے نہیں لکھتا تھا، خود عزیز احمد کو کسی زمانے میں یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ ترقی پسند ادب میں منٹو پر یہ سطریں بھی ملتی ہیں "اس قسم کے افسانوں کی سماجی نقطۂ نظر سے ایک ہی وجہ جواز ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ بچوں کو شروع سے جنسی تعلیم ملنی چاہیے۔ لیکن اس خامی کو واضح کرنے کے لئے ایسے ترغیب انگیز افسانے لکھنا جن کو پڑھ کے بھی بچے جنس کو اور مریضانہ نظر سے دیکھیں، انقلابی نقطۂ نظر سے ہرگز جائز نہیں۔" لیکن منٹو نے افسانے بچوں کے لئے نہیں لکھے۔ بچوں کے لئے علاحدہ ادب کی ضرورت ہے۔ یہ والدین کی دانشمندی نہیں کہ بچوں کے ہاتھ میں مادام بواری، ٹیڑھی لکیر، گریزیا آگ رکھ دی جائے۔ منٹو کا مخاطب ان لوگوں سے بھی نہیں جو کتاب کو دل لگی یا جنسی تلذذ کی خاطر ہاتھ میں اٹھاتے ہیں۔ ان لوگوں کی ذہنی عیاشی کا سامان مہیا کرنے کے لئے بڑے بالوں اور افسردہ آنکھوں والے ادیب موجود ہیں جو بڑی تیز رفتاری سے گناہ کی راتوں میں اضافہ کر رہے ہیں۔ منٹو فن کار تھا۔ اسے ادب کی رفعتوں کا احساس تھا۔ اس کے صحیح مخاطب ذہین قارئین تھے جو ادب کا سائنٹفک طریقہ پر مطالعہ کرتے ہیں۔ اس نے جنس پر جو افسانے لکھے ہیں انھیں سنجیدگی سے پڑھنا اور ہمدردی سے ان پر غور کرنا کسی عام دل و دماغ والے شخص کا کام نہیں۔ سہل پسند طبیعتوں کی وقت گزاری کا سامان ایم اسلم۔ دت بھارتی۔ نسیم حجازی وغیرہ۔ اپنی اپنی بساط کے مطابق بہم پہنچا رہے ہیں۔ حرم گھرانہ کی عورتوں، ذہنی طور پر مفلوج بزرگوں اور جوش جہاد پیدا کرنے والے نوجوانوں کے لئے یہ ادیب کافی ہیں۔ منٹو ان کی جگہ لینا نہیں چاہتا۔ وہ خود کہتا ہے "جو لوگ روحانی ذہنی اور جسمانی لحاظ سے تندرست ہیں اصل میں ان ہی کے لئے شاعر شعر کہتا ہے۔ افسانہ نگار افسانہ لکھتا ہے اور مصور تصویریں بناتا ہے۔۔۔ میرے افسانے تندرست اور صحت مند لوگوں کے لئے ہیں۔ نارمل انسانوں کے لئے جو عورت اور مرد کے رشتہ کو استعجاب کی نظر سے نہیں دیکھتے۔" اسی لئے جب منٹو جنس پر لکھتا ہے تو اسے خوف افسانہ کے عریاں یا فحش ہونے کا نہیں بلکہ فنی لحاظ سے افسانہ کے کامیاب یا ناکام ہونے کا ہوتا ہے۔ اسے خوف ہوتا ہے تو یہی کہ حقیقت کی تصویر دھندلی نہ رہ جائے۔ تجربے کے بھرپور اظہار میں کمی نہ رہ جائے وہ جانتا ہے کہ جن لوگوں کے لئے وہ لکھ رہا ہے وہ اس کے افسانوں کو جنسی تلذذ کی خاطر نہیں بلکہ جنسی تجربہ اور اس تجربہ کے نفسیاتی پیچ و خم کے مطالعہ کے طور پر پڑھیں گے۔ وہ لچھے دار اور چٹپٹی کہانیاں نہیں لکھتا جن کو پڑھتے ہی رال بہنی شروع ہو جائے۔ "ہم داؤ پیچ بتانے والے خلیفے نہیں۔ ہم جب اکھاڑے میں کسی کو گرتا دیکھتے ہیں تو اپنی سمجھ کے مطابق آپ کو بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ کیوں گرا۔" اسی لئے عریاں نگار اور فحش نگار کا جو زہر آلود تیر منٹو پر پھینکا جاتا ہے وہ اپنا نشانہ خطا کرتا ہے۔ منٹو کے بدنام سے بدنام افسانوں میں بھی کوئی جنسی اشتعال نہیں ملتا۔ ہتک، کالی شلوار، ڈرپوک، ٹھنڈا گوشت، دھواں، کوئی بھی افسانہ ان معنوں میں جنسی ہیجان پیدا نہیں کرتا جن معنوں میں عزیز احمد کے ناول ہوس اور مرمر و خون، اشک کا افسانہ اُبال۔ اطالوی مصنف موروویا کی ناول روم کی عورت یا پیری لوئی کا ناول افروڈیٹ جنسی ہیجان پیدا کرتے ہیں۔ منٹو کا مقام دنیا کے عظیم فن کاروں کے درمیان ہے۔ وہ موپاساں جیمس جائس۔ لارنس زولا وغیرہ کی صف کا ادیب ہے جن کی تخلیقات فکر انگیز، باشعور اور بصیرت افروز ہوتی ہیں۔ ان کے ہاں جنس کا ذکر اس لئے ملتا ہے کہ جنس زندگی کی بنیادی حقیقت ہے اور موجودہ معاشرہ میں جنس کی پیچیدگیوں کو سمجھنا، الجھنوں کو دور کرنا اور صحت مند جنسی تعلقات کے امکانات پر فلسفیانہ سوچ بچار کرنا ان کا مطمح نظر ہے۔ وہ جنسی تعلقات کے مختلف مظاہر کو سماجی پس منظر میں دیکھتے ہیں۔ جنسی جذبہ اور اس کے اظہار کے مختلف طریقوں کی نوعیت اور ماہیت کا نفسیاتی تحقیقات کی روشنی میں تجزیہ کرتے ہیں اور جدید تہذیب و تمدن نے جنسی تعلقات کو کس طرح متاثر کیا ہے اور ان میں کیا اچھی بری تبدیلیاں کی ہیں اسے اجاگر کرتے ہیں جس فن کار کو اتنے اہم اور پیچیدہ مسائل سے واسطہ ہو اسے ذہنی عیاشی اور ہیجان انگیزی کی کم ہی فرصت ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منٹو اپنے افسانوں میں مشکل اور نازک مقامات سے آسانی کے ساتھ گزر گیا ہے۔ وہ روزن اور شگاف کے ذریعہ خلوت کدوں میں جھانکنے والا فن کار نہیں۔ وہ میاں بیوی کی نوک جھونک کو یکجائی یا قلعۂ معلی کی زبان میں بیان نہیں کرتا۔ مثلاً اپنی ڈائری میں وہ جنسی فعل کے طریقے نہیں بتاتا۔ بلکہ یہ بتاتا ہے کہ ازدواجی زندگی میں جنسی تعلقات ایسی صورت بھی اختیار کر لیتے ہیں اور آسمان سے ستارے توڑ لانے والے شوہر کے لئے کچھ ہی لمحوں کے بعد باورچی خانہ سے وہ دودھ لانا بھی بار معلوم ہونے لگتا ہے۔

محبت اور خصوصاً عنفوان شباب کی رومانی محبت پر منٹو کے یہاں کم ہی افسانے ملتے ہیں۔ لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ کے چند کامیاب اور دلچسپ افسانے شروع میں منٹو نے لکھے تھے۔ مثلاً غسل خانہ، شوشو، میرا اور اس کا انتقام۔ وغیرہ ان میں مریضانہ جنس پرستی اور انفعالیت کے بجائے ایک صحت مند جنسی approach ملتا ہے۔ عشق حقیقی بظاہر رومانی محبت پر طنز معلوم ہوتا ہے لیکن اس کا انجام دردناک ہے۔ محبت کے معاملہ میں بھی انسان کس قدر کمزور ہے کہ ایک معمولی سا واقعہ بھی محبت کے شیش محل کو چکنا چور کر کے رکھ دیتا ہے۔ وہ بزعم خود سمجھتا تو یہی ہے کہ اس کی محبت چٹان کے مانند ٹھوس اور غیر متزلزل ہے لیکن یہ چٹان سیلاب حوادث کا ایک تھپیڑا بھی برداشت نہیں کر سکتی اور "جاؤ حنیف جاؤ" میں بھی محبت نسائی پاکیزگی کے مبہم اخلاقی تصور پر قربان کر دی جاتی ہے۔ "بانجھ" اس کے برخلاف ایک ایسا افسانہ ہے جس میں محبت اور وہ بھی ایک خیالی محبت پر اپنا سب کچھ قربان کر دیا جاتا ہے۔ وہ شخص جسے زندگی میں محبت نہیں ملی۔ وہ اپنی پیاس کو محبت کے ایک تخیلی واقعہ سے بجھانا چاہتا ہے۔ تخیل کا رنگ گہرا ہو جاتا ہے اور وہ سراب جو تشنگی کو بجھانے کے لئے تخیل نے پیدا کیا تھا ایک حقیقت بن جاتا ہے۔ خیالی محبت کی خیالی بچہ پر کو مار کر ہیرو خود بھی مر جاتا ہے۔

جنس پر منٹو کے تمام افسانے کامیاب نہیں ہیں۔ مثلاً دھواں، مس ٹین والا، کتاب کا خلاصہ، ادبی تخلیق بننے سے معذور ہیں۔ بلاؤز کامیاب ہے لیکن اس کی ادبی اہمیت مشکوک ہے۔ یہ ناکامی کچھ تو موضوع پر قدرت نہ ہونے کی وجہ سے اور کچھ نفس موضوع کے معمولی ہونے کی وجہ سے ہے۔ مثلاً جہاں تک موضوع کا تعلق ہے دھواں، بلاؤز سے زیادہ اہم ہے۔ لیکن بلاؤز میں منٹو اپنے موضوع پر زیادہ حاوی ہے۔ دھواں کی رمزیت اور اشاریت مبہم ہو گئی ہے۔ نو دس سال کے بچے میں پہلے پہل جنسی لہر کس طرح پیدا ہوتی ہے اس کا تجزیہ منٹو نے ایک خاص طریقہ سے کیا ہے۔ لیکن تجزیہ اتنا واضح نہیں ہے جتنا بلاؤز میں۔ بلاؤز میں عنفوان شباب کے آغاز ہی کے ساتھ مومن کے جذبات میں جو تلاطم پیدا ہوتا ہے اس کو منٹو نے کمال کامیابی اور فن کارانہ

عبارت سے بیان کیا ہے۔ مبہم جنسی احساسات کی نقاب کشائی اور ان احساسات کے محرک خارجی واقعات، نفسیاتی الجھن اور جسمانی تشنج کا اظہار منٹو نے بھرپور طریقہ سے کیا ہے۔ دھواں ایک نفسیاتی تجزیہ کے طور پر اہم افسانہ ہے لیکن ناکام ہے بلاؤز غیر اہم ہے لیکن کامیاب ہے۔ دونوں افسانے منٹو کے بہترین افسانے نہیں ہیں۔ عموماً تمام نقادوں نے بلاؤز کو پھاہا کے ساتھ ساتھ گھناؤنا بتایا ہے۔ جس میں ایک خاص قسم کی واقعہ نگاری کے سوا اور کوئی بات نہیں۔ ایسی واقعہ نگاری جو فطرت کے ایک عام عمل کو ظاہر کرتی ہے اور اس سے آگے کسی مقصد کی طرف ہماری رہبری نہیں کرتی۔ افسانہ کی تمام تر خوبی فطرت کے اس عمل کے تجزیہ اور نفسیاتی محرکات کے مطالعہ میں پنہاں ہے۔

منٹو خواب کی دنیا کو نہایت حقیقی رنگ میں بڑی چابکدستی سے پیش کرتا ہے۔ بلاؤز میں مومن کے خواب کو چند ہی سطروں میں نہایت خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ ''ٹیڑھی لکیر'' کا ہیرو ایک جگہ کہتا ہے ''اور پھر بخار چڑھ جانے سے جو خواب آتے ہیں۔۔۔۔ واللہ کس قدر بے ربط ہوتے ہیں۔ ابھی تم یہ دیکھتے ہو کہ تمہاری شادی کسی نہایت ہی حسین عورت سے ہو رہی ہے۔ دوسرے لمحہ یہی عورت تمہاری آغوش میں ایک قوی ہیکل پہلوان بن جاتی ہے۔'' خواب کی اسی کیفیت کو، نیم بیداری اور نیم بیہوشی کی اسی حالت کو پھندنے میں منٹو نے نہایت کامیابی سے پیش کیا ہے۔ سلواڈور ڈالی کی تصاویر اور جائس کی فنا زن ویک سے ان افسانوں کا تقابل دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

منٹو کے اکثر جنسی افسانوں کی کمزوری عریانی یا فحاشی نہیں جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے بلکہ وہ مجرد اور مخصوص قسم کی واقعہ نگاری ہے جو حقیقت کو اپنے سماجی عواقب وعواطف سے منقطع کرکے پیش کرتی ہے۔ مثلاً شاداں، سرکنڈوں کے پیچھے۔ پڑھیے کلمہ، کتاب کا خلاصہ۔ مس ٹین والا، اللہ دتا وغیرہ کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ عریاں یا فحش ہیں۔ یہ افسانے تکنیک۔ فن۔ اسلوب۔ زبان ہر لحاظ سے کامیاب ہیں لیکن یہ بڑا ادب پیش نہیں کرتے۔ ان میں زندگی کے جو تجربات پیش کیے گئے ہیں۔ وہ زندگی کے جاندار، عموی اور اہم تجربات نہیں ہیں۔ یہ تجربات کسی بہتر حقیقت کا انکشاف نہیں کرتے ان افسانوں میں صرف واقعہ نگاری ہے۔ چند غیر معمولی حقیقتوں کو پیش کیا گیا ہے۔ لیکن یہ حقیقت نگاری ادب، زندگی اور اخلاق کی نئی قدروں کی تخلیق نہیں کرتی۔ انھیں پڑھ کر ہمارے شعور میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ ہم خود کو وہیں محسوس کرتے ہیں جہاں پہلے تھے۔ اچھا ادب وہ ہے جس کے مطالعہ سے ہم خود کو پہلے سے بہتر محسوس کرنے لگیں۔ ہمیں محسوس ہو کہ ہم زندگی کے چند بنیادی حقائق اور اہم تجربات سے دوچار ہوئے ہیں۔ منٹو حقیقت نگار اور حقیقت شناس ہے لیکن ان افسانوں میں حقیقت نگاری کی سطح کچھ زیادہ بلند نہیں ہے۔ اگر فن کار زندگی کی عام۔ مانوس اور اہم حقیقتوں سے رشتہ توڑ کر محض قیاسی واقعات یا ایسے حادثات کا ذکر کریں جن کا ہونا ناممکنات میں سے تو نہ ہو لیکن جو شاذ ہی معرض وجود میں آتے ہوں تو پھر فن کا زوال لازمی ہے۔ مثلاً یہ تو قطعی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ وہ واقعات جو شاداں، سرکنڈوں کے پیچھے، پڑھیے کلمہ' کتاب کا خلاصہ اور اللہ دتا میں رونما ہوئے ہیں وہ ہو ہی نہیں سکتے لیکن فی الحقیقت وہ اس قدر غیر یقینی نوعیت کے حامل ہیں کہ ان کا ہونا فطرت کے نظام میں غیر متوقع حادثات سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ ایسے حادثات جن کا مناسب مقام اخباروں یا نفسیاتی کتابوں میں ہے ادب میں نہیں۔ ادب فلسفہ اور صحافت کے خوب صورت امتزاج کا نام ہے۔ فلسفہ میں مجرد خیالات ہوتے ہیں بغیر واقعات کے۔ صحافت میں واقعات ہوتے ہیں بغیر فلسفہ کے۔ ادب زندگی کے کسی واقعہ کو لیتا ہے اور اس میں فلسفیانہ رنگ آمیزی کرکے اس میں عمومیت اور توانائی پیدا کرتا ہے۔ ادب میں جب یہ توازن ٹھیک نہیں رہتا تو وہ یا تو فلسفہ کی کوئی کتاب بن جاتا ہے یا محض صحافت۔ اخباری رپورٹ کسی واقعہ کی محض خبر دیتی ہے اس واقعہ کے سماجی پہلوؤں اور نفسیاتی محرکات پر روشنی ڈال کر کوئی ذہنی روشنی نہیں پہنچاتی۔ اس کے برخلاف ادب کسی واقعہ کو عن وعن پیش نہیں کرتا بلکہ اس کے تمام پوشیدہ رخوں، دھندلے پہلوؤں اور مبہم نقوش کو نکھار کر حقیقت کو ایک ایسا روپ دیتا ہے جس کا مطالعہ زندگی پر از سر نو غور کرنے پر ہمیں مجبور کرتا ہے اور اس حقیقت کے ذریعہ ہم زندگی کی کچھ نئی قدریں، اخلاق کے نئے تصورات حاصل کرتے ہیں۔

یزید، تخلیق حسن، خالی ڈبے، خالی بوتلیں، بلونت سنگھ مجیٹھیا اور اس قسم کے دوسرے افسانوں میں بھی یہی کمزوری ہے یہ افسانے مذکورہ بالا افسانوں جیسے ہولناک یا گھناؤنے نہیں ہیں لیکن ان میں بھی جو حقائق بیان ہوئے ہیں وہ زندگی کے عام حقائق نہیں ہیں۔ ان میں جو کردار ہیں وہ منٹو کے دوسرے غیر فانی کرداروں مثلاً سوگندھی، سلطانہ، موذیل، بابو گوپی ناتھ، کیشو لال وغیرہ کی طرح جانے بوجھے اور مانوس کردار نہیں ہیں۔ ان افسانوں کے کرداروں کو جن حالات سے گزرنا پڑتا ہے اور جو تجربات انھیں پیش آتے ہیں ان سے ہم اجنبیت اور نامانوسیت سی محسوس کرتے ہیں۔ مسز ڈی کوسٹا اور مسز ڈی سلوا سے جو منٹو کے افسانے میں کوئی اونچا مقام نہیں رکھتے ہم کوئی غیریت محسوس نہیں کرتے۔ ان میں زندگی کی حرارت ہے اور ان کے کردار ہمارے ادبی حافظہ کے نگارخانہ میں پرکشش تصویروں کی طرح آویزاں ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ مسز ڈی سلوا کا شوہر جو افسانہ میں کبھی کبھار ہی نظر آتا ہے اور جو بے ضرر عام کاروباری قسم کا خاموش طبع انسان ہے، بمبئی کے عیسائی ماحول کا ایک چلتا پھرتا انسان نظر آتا ہے۔ افسانہ کی واحد متکلم مسلمان گھرانہ کی ایک عورت ہے، نہایت دلچسپ شخصیت اختیار کرلیتی ہے۔ ان افسانوں میں ایک فضا ہے ایک ماحول ہے۔ جانی بوجھی صورتیں ہیں۔ روزمرہ کے مسائل ہیں۔ جیتے جاگتے کردار ہیں۔ ہتک۔ کالی شلوار۔ موذیل بابو گوپی ناتھ، باسط، ممی، رام کھلاون، خوبھا بائی وغیرہ افسانوں کا تو ذکر ہی نہیں جن کے کردار منٹو کے سحر طراز قلم کی بہترین تخلیقات ہیں۔ خیر اخیر میں منٹو پر جو مختلف حلقوں سے نکتہ چینی کی گئی اس کی وجہ بھی عموماً یہی تھی کہ منٹو کی حقیقت نگاری جس پر اردو ادب کو فخر تھا اس کے اکثر افسانوں میں ایک غلط سمت چل پڑی تھی اور محض قیاسی واقعات غیر معمولی حادثات اور بے جان کرداروں کی بنیاد پر اس نے اکثر افسانوں کی عمارت تعمیر کی تھی۔ لیکن ہمیں اس خوش فہمی میں بھی نہیں رہنا چاہیے کہ منٹو کے متعلق ہمارا زاویہ نظر ہمیشہ درست رہا ہے۔ اردو کے اکثر نقادوں نے منٹو کی تحریروں کو فحش کہہ کر ان کی ادبی اہمیت کم کرنے کی کوشش کی ہے حالانکہ محض فحاشی یا عریانی کو کسی ادبی تخلیق کے کم یا گراں مایہ ہونے کا صحیح معیار قرار نہیں دیا جاسکتا۔ سرکنڈوں کے پیچھے۔ اللہ دتا۔ اور کتاب کا خلاصہ عریاں نہیں۔ وہ فحش بھی نہیں۔ لیکن وہ منٹو کے اچھے افسانے نہیں ہیں۔ بو۔ ٹھنڈا گوشت۔ کالی شلوار۔ جانکی۔ بری لڑکی میں عریانی آگئی ہے لیکن یہ منٹو کے کامیاب افسانے ہیں۔ منٹو لغزش اس وقت کھاتا ہے جب وہ عام زندگی سے قطع تعلق کرکے کسی نفسیاتی گتھی یا جنسی الجھن کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مثلاً شاداں۔ اُسے ناکامی اُس وقت ہوتی ہے جب وہ اردگرد کی حقیقی زندگی کو پیش کرکے نتائج اخذ کرنے کے بجائے نفسیاتی کتابوں کی case histories کو حقیقی زندگی پر منطبق کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مثلاً مس ٹین والا۔ اس کے فن میں انحطاط اس وقت آتا ہے جب وہ زندگی کی مانوس۔ عموی اور اہم حقیقتوں کے بجائے محض چونکا دینے یا سنسنی پیدا کرنے کی خاطر ایسی چیزوں پر لکھتا ہے جن کی نوعیت حادثاتی اور اتفاقی ہے اور جو بقول ممتاز شیریں improbable possiabilty کے تحت آتی ہیں۔ مثلاً سرکنڈوں کے پیچھے۔ اللہ دتا۔ پڑھیے کلمہ۔ منٹو کے فن کی یہ کمزوریاں تھیں جن پر ہمیں خلوص اور ہمدردی سے تنقید کرنی چاہیے تھی، منٹو شاید ہماری تنقید سے بددل نہ ہوتا۔ لیکن ہم نے الزام تراشی، طنز اور طعنہ زنی سے کام لیا اور متعصبانہ ذہنیت کے زیر اثر اس کی اچھائیوں پر بھی پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔ سردار جعفری نے منٹو کو ایک خط میں لکھا تھا

"میں تمہاری افسانہ نگاری پر ایک طویل مضمون لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ تمہیں دقیانوسی قسم کے لوگوں نے ابتک گالیاں ہی دی ہیں ان سے اور کسی چیز کی توقع بے کار ہے۔"

لیکن افسوس ہے کہ سردار جعفری کا رویہ بھی کچھ غیر دقیانوسی نہیں رہا۔ ان کی کتاب "ترقی پسند ادب" کے سب سے کمزور مقامات وہ ہیں جہاں وہ منٹو پر ناشائستہ اور جارحانہ حملے کرتے ہیں۔ ایسے حملے جن سے جعفری کا تنقیدی خلوص بھی مشتبہ ہو جاتا ہے۔ جب وہ غصہ میں لکھتے ہیں: "وہ (منٹو) بار بار اعلان کرتا ہے کہ میں پروپگنڈا نہیں کرتا۔ میں تو صرف آرٹ اور ادب پیدا کرتا ہوں۔ میں صرف رنڈیوں، چکلوں اور بھڑووں کے بارے میں لکھتا ہوں اور اس غلاظت کو گوارا بنانے کے لئے وہ حسن عسکری سے سند لیتا ہے کہ یہ اسلامی ہے" تو ان کی تنقید غلط بیانی تک پہنچ جاتی ہے۔ ایک جگہ وہ نعرہ کا تجزیہ اس طرح کرتے ہیں "ہمارے بہت سے ادیب تو مزدور کا مطلب بھی نہیں سمجھتے۔ سعادت حسن منٹو غلطی سے کسی چنا بیچنے والے کو مزدوروں کا نمائندہ سمجھ لیتے ہیں اور اس کی زبان سے سیٹھ (مالک مکان) کو گالی دلوا کر یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے انقلابی ادب کی تخلیق کی ہے۔ لیکن مزدور یہ کہانی پڑھ کر منٹو کی سادگی پر ہنس دیتا ہے۔" کاش منٹو اس قدر سادہ لوح ہوتا۔ لیکن بدقسمتی سے منٹو کافی سمجھدار تھا۔ سردار جعفری نے مثال غلط افسانہ سے دی۔ "خونی تھوک" میں ممکن ہے انھیں قلی کے روپ میں کوئی انقلابی مزدور دکھائی دے جاتے انہوں نے خواہ مخواہ نعرہ جیسی حسین کہانی پر عمل جراحی کیا۔ اس افسانہ کی تخلیق کے وقت منٹو کے سامنے نہ تو سرمایہ دار اور مزدور کی کشمکش کا مسئلہ تھا نہ ہی وہ انقلابی ادب پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اس نے کسی جگہ بھی مزدور اور سرمایہ دار کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے اس کے سامنے جو مقصد تھا وہ نہایت ہی واضح تھا اور اس نے نہایت وضاحت سے اس مقصد کو افسانہ میں پیش بھی کیا۔ اس افسانہ میں منٹو کے پیش نظر جو مسئلہ تھا وہ کیشو لال کھاری سینگ والے کا طبقاتی کردار پیش کرنا نہیں تھا بلکہ اس ذہنی انتشار اور جذباتی ہیجان کا تجزیہ اور اظہار تھا جو کیشو لال کی خوددار طبیعت میں مالک مکان کی دو گالیوں نے پیدا کر دیا تھا۔ سیٹھ کی گالیوں کو، جو اس کے تھوک بھرے منہ سے اس طرح نکلی تھیں جیسے دو بڑے بڑے چوہے موریوں سے باہر نکلتے ہیں۔ سُن کر کیشو لال خاموش رہا تھا۔ وہ کیشو لال جو ناک پر مکھی بھی بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ لیکن اس کی خاموشی میں ایک زبردست طوفان پنہاں تھا۔ اس کے جذبات میں ایک ایسا ہلڑ مچا ہوا تھا جس طرح کسی گرما گرم جلسہ میں کسی شرارت سے بھگدڑ مچ جایا کرتی ہے۔ منٹو نے اس جذباتی خلفشار کو مختلف اشاروں، کنایوں، تشبیہوں اور تمثیلوں کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ اس نے کیشو لال کے دل اور دماغ کے تمام دریچے کھول دیئے ہیں اور ہم بہ آسانی بڑی صفائی سے اس ذہنی پریشانی، اعصابی تشنج اور جذباتی انتشار کو دیکھتے ہیں جس نے اس کے سکون کو غارت کر دیا تھا۔ اس ہیجان سے نجات اسے اسی وقت ملتی ہے جب وہ عالی شان ہوٹل کے نیچے کھڑے ہو کر کان پھاڑ دینے والی آواز میں ایک نعرہ لگاتا ہے۔ "ہت تیری۔"

کیشو لال کو منٹو نے کسی بیدار مزدور یا باشعور سیاسی انسان کے طور پر پیش نہیں کیا۔ وہ جو کچھ بھی سوچتا ہے ایک عام سمجھ بوجھ والا انسان ایسی صورت حال میں کچھ اس سے مختلف طریقہ پر نہیں سوچے گا۔ اس کے خیالات کبھی سیاسی رنگ اختیار نہیں کرتے۔ افسانہ کی کامیابی کا راز اس ذہنی کیفیت کے تجزیہ میں ہے جو ہر اس شخص کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے جسے اپنے سے برتر یا طاقتور انسان کی گالی گلوچ یا جھڑکیاں سننے کا شرف حاصل ہوا ہو۔

ذہنی پریشانی اور طبیعت کی پراگندگی کو منٹو نے اور بھی بہت سے افسانوں میں کامیابی سے پیش کیا ہے۔ خالد میاں اس نوعیت کا منٹو کا سب سے کامیاب افسانہ ہے۔ ممتاز کو وہم ہو جاتا ہے کہ اس کا بچہ خالد ایک سال کا ہونے سے پیشتر ہی مر جائے گا بچہ کی علالت کے دوران میں یہ وہم اس قدر زور پکڑ جاتا ہے اور ایسی مختلف صورتیں اختیار کر لیتا ہے کہ ممتاز کے حواس جواب دے جاتے ہیں۔ ممتاز فطری طور پر توہم پرست نہیں ہے لیکن اپنے بچے سے اس کا لگاؤ اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ ہر خیال ایک وہم کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ممتاز کی پراگندہ طبیعت کو منٹو نے اس قدر بھرپور طریقہ پر پیش کیا ہے کہ افسانہ کسی ذاتی تجربہ پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ کرشن چندر نے لکھا ہے کہ منٹو کس طرح اپنے ڈیڑھ سالہ بچے کی موت پر پھوٹ پھوٹ کر رویا تھا۔ منٹو نے اس افسانہ میں زندگی کے بے پناہ غم کو سمو دیا ہے۔ افسانہ المناک ہے لیکن انجام کو پہنچ کر اسی سکون کا احساس ہوتا ہے جو مکھتو کی موت کے بعد محسوس ہوتا ہے۔ مکھتو کی موت اس کی بے چین اور بے قرار روح کے لئے سکون کا پیغام لاتی ہے۔ بچے کی موت دردناک ہے لیکن ممتاز کے وہم کے پھیلتے اور بڑھتے ہوئے سائے تو اس سے بھی زیادہ تاریک اور گھٹن پیدا کرنے والے ہیں۔ ممتاز جب اپنے بچے کی لاش کے پاس جا کر اس کے ریشمیں بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتا ہے "خالد میاں میرے وہم لے جائیں گے آپ۔" تو بچے کی موت پس منظر میں چلی جاتی ہے اور ممتاز کے توہمات جو موت سے بھی زیادہ ناقابل برداشت ہیں پیش منظر میں آ جاتے ہیں۔ انسانی فطرت کی کمزوریاں اور ان کے المناک مظاہر کو کس قدر ہمدردی سے منٹو نے اس افسانہ میں پیش کیا ہے۔

جنس کا رجحان منٹو پر حاوی ہونے کے باوجود اس نے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ اس کے افسانوں کا پس منظر ہر نوع اور ہر قسم کے رنگ لئے ہوئے ہے۔ منٹو کو نظریاتی سیاست اور سیاسی گتھیوں کو سلجھانے سے دلچسپی نہیں۔ لیکن سیاست کے عملی مظاہروں کی اس کے افسانوں میں فراوانی ہے۔ دیوانہ شاعر، شرابی، نیا قانون، تماشا، ۱۹۱۹ء کی ایک بات، سوراج کے لئے، میں جذبۂ آزادی، ستیاگرہ، مسلح جدوجہد، فوجیوں کا مقابلہ، لاٹھی چارج، سنسناتی ہوئی گولیاں، لاشوں کو روندتے ہوئے گھوڑ سے سوار، جلیان والا باغ کا قتل عام غرض کہ ان تمام واقعات کی مصوری ملتی ہے جو آزادی کی جنگ میں وقوع پذیر ہوئے۔ منٹو نے سیاسی تحریکوں کو پس منظر بنا کر مخصوص نفسیاتی الجھنوں کی بھی عقدہ کشائی کی ہے۔ مثلاً سوراج کے لئے۔ ۱۹۱۹ء کی ایک بات وغیرہ۔ سوراج کے لئے میں منٹو کا طنز اس سیاست گری پر ہے جس میں مداری زیادہ اور لیڈر کم ہوتے ہیں۔ جو ہیں وہ قوانین فطرت کے خلاف چل رہے ہیں، غرض یہ کہ منٹو نے سیاست پر دوسرے ادیبوں سے زیادہ نہیں تو بہتر ضرور لکھا ہے۔ وقار عظیم نے بالکل درست کہا ہے "بڑھتی ہوئی سیاسی حس کی ترجمانی تقریباً ہر جگہ ہے لیکن اس حس کے عملی مظاہروں کے نقوش جیسے منٹو کے افسانوں میں جتنے اُبھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کسی اور کے یہاں نہیں دکھائی دیتے۔

اسی طرح منٹو نے فسادات۔ کشمیر کی جنگ وغیرہ پر بہت سے افسانے سپرد قلم کیے ہیں۔ آخری سلیوٹ اور ٹیٹوال کا کتا، کشمیر کی جنگ پر قابل قدر افسانے ہیں۔ انسان دوستی اور جاذبیت کی ان افسانوں میں فراوانی ہے۔ ان موضوعات پر منٹو نے نہیں لکھا اس لئے کہ وہ ادیب کی سماجی اور سیاسی ذمہ داری سے سبکدوش ہونا چاہتا تھا۔ یا آنے والی نسلوں کے اس طعنے سے بچنا چاہتا تھا کہ منٹو نے اپنے زمانہ کے اہم واقعات کی ترجمانی نہیں کی۔ منٹو ہر اس موضوع پر لکھنے کو تیار ہے جس کی سمائی فن کارانہ طریقہ پر اس کی کہانیوں میں ہو سکتی ہے۔ اس نے انسانی فطرت کے مطالعہ کے لئے جو بھی پس منظر ملا انتخاب کر لیا۔ اس کی توجہ اور دلچسپی کا مرکز ہمیشہ انسان اور انسانی فطرت کی نیرنگیاں رہی ہیں۔ سیاسی تحریکوں اور فسادات کے پس منظر میں بھی اس نے انسان کی شخصیت کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ اسی لئے اس کے افسانوں میں ادبی اور انسانی قدروں کی فراوانی ہے۔ وہ محض اخباری رپورٹیں نہیں بلکہ زندگی اور انسان کے نفسیاتی مطالعے ہیں۔ مخصوص اور غیر معمولی حالات میں انسان سے کیا حرکتیں سرزد ہوتی ہیں اور اس میں نفسیاتی طور پر کیا تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں اس کا منٹو نے نہایت بالغ نظری اور حقیقت پسندانہ طریقے سے

جائزہ لیا ہے۔ وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ منٹو نے فسادات سے بھی جنسی تلذذ حاصل کرنے کی کوشش کی ہے، غلط بیانی سے کام لیتے ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ کھول دو۔ ٹھنڈا گوشت۔ رام کھلاون اور موذیل سے منٹو یا کوئی اور شخص کس طرح جنسی تلذذ حاصل کرسکتا ہے۔ منٹو نے فسادات پر بھی شاہکار افسانے نہیں لکھے نہ کسی ادیب کے کسی ایک موضوع پر سب کے سب افسانے شاہکار ہوتے ہیں فسادات کے موضوع پر منٹو نے اردو ادب کو چند گراں بہا کہانیاں دی ہیں۔ اس نے رام کھلاون کا کردار دیا ہے۔ اس نے ایشر سنگھ کا کردار دیا ہے جو حیوان بن کر بھی اپنی انسانیت نہیں کھو سکا۔ اس نے بدچلن اور آوارہ یہودن موذیل کی شخصیت سے اردو ادب کو روشناس کرایا ہے۔ موذیل جو اپنی تمام بدچلنی کے باوجود ایک دردمند اور پاکیزہ دل رکھتی ہے اور ایک سکھ لڑکی کی جان بچانے کی خاطر خود کو غنڈوں کے حوالے کر کے مر جاتی ہے۔

منٹو کے افسانوں میں ہماری شہری زندگی کے تمام نشیب و فراز اور پیچ و خم ملتے ہیں۔ وہ تمام نفسیاتی الجھنیں، جنسی پیچیدگیاں، معاشی بدحالی، ذہنی پریشانیاں، احساس تنہائی اور بے پایاں روحانی خلا جس کا آج شہر کا ہر نوجوان شکار ہے منٹو کے افسانوں میں منعکس ہے۔ فرد جو اجتماعی زندگی سے اپنا رشتہ توڑ چکا ہے اور جسے شہری طریقۂ زندگی خود اپنے اندر سمیٹنے پر مجبور کر رہا ہے۔ جو زندگی کی اس گھما گھمی میں خود کو تنہا اور اجنبی محسوس کرتا ہے جو آبائی خاندانی زندگی سے رشتہ توڑ چکا ہے لیکن کسی ایسی ٹھوس زمین پر قدم جمانے نہیں پایا جو اس میں خود اعتمادی اور زندگی گزارنے کا سلیقہ پیدا کر سکے۔ وہ فرد جو روایاتی اخلاق کی زنجیر توڑ بیٹھا ہے لیکن نئی اخلاقی قدریں پیدا کرنے سے قاصر ہے جو ایک مانوس اور سہل طریقۂ زندگی چھوڑ کر دوسرے طریقۂ زندگی کی تلاش میں نامانوس اور دشوار گزار وادیوں میں بھٹک رہا ہے۔ جو کبھی انسانیت اور اخلاق کی انتہائی بلندیوں کو چھو لیتا ہے (باسط، بابو گوپی ناتھ) اور کبھی حیوانیت کے تاریک گڑھوں میں گر پڑتا ہے۔ (ہلاکت، راج کشور) جو جسم کی بجائے روح سے محبت کرنا چاہتا ہے لیکن جسم اس کا راستہ روکے کھڑا رہتا ہے (عشق حقیقی) عصمت کا آبگینہ جس کی محبت کی استوار بنیادوں سے ٹکرا کر ان میں تزلزل پیدا کر دیتا ہے (جاؤ حنیف جاؤ) یہی فرد اپنی تمام پہلو دار شخصیت کو لیے منٹو کے افسانے میں موجود ہے۔

شہری زندگی کے پس منظر کے طور پر منٹو نے امرتسر۔ لاہور۔ دہلی۔ بمبئی۔ پونہ اور دوسرے مختلف شہروں کو پیش کیا ہے ان تمام شہروں میں بمبئی منٹو کے افسانوں میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس شہر کی زندگی کا خمیر سرمایہ اور محنت۔ عیاشی اور فاقہ کشی۔ رکھ رکھاؤ اور کھوکھلا پن۔ مانوسیت اور اجنبیت۔ غرض کہ ان تمام متضاد عناصر سے مل کر تیار ہوا ہے جو موجودہ صنعتی اور سرمایہ دارانہ نظام کی دین ہیں۔ منٹو کی زندگی کا بیشتر حصہ اسی شہر میں گزرا جہاں ہر شخص زندگی کی دوڑ میں بازی لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ منٹو کا قیام بھی بائیکلہ میں رہا۔ بعد میں جب اس کے قدم کسی حد تک جم گئے تب بھی وہ ملازمت تو بمبئی ٹاکیز میں کرتا تھا جو بمبئی سے میلوں دور گورے گاؤں میں واقع ہے لیکن اس کی سکونت کلیر روڈ ہی کے ایک فلیٹ میں تھی جو بائیکلہ میں واقع ہے۔ اس طرح متوسط۔ نچلے متوسط اور سماجی طور پر بالکل گرے ہوئے طبقے سے اس کا رشتہ دوسرے ادیبوں کی نسبت زیادہ گہرا رہا۔ منٹو برسوں تک ان لوگوں کے قریب رہا۔ اس ماحول کو گہری نظر سے دیکھا اور اس کچلی ہوئی زندگی کے تلخ جام کو بھرپور طریقہ پر پیا۔ یہی تلخابۂ زندگی کا یہی زہراب تھا جو بعد میں اس کے افسانوں میں جھلکنے لگا۔ کرشن چندر نے غلط نہیں کہا کہ "وہ اردو ادب کا واحد شنکر ہے جس نے زندگی کے زہر کو خود گھول کر پیا ہے اور پھر اس ذائقہ کو، اس کے رنگ کو کھول کھول کے بیان کیا ہے۔" بمبئی میں اردو کے اور بھی ادیب آئے لیکن کسی نے بمبئی کی زندگی کو اتنے پہلودار طریقہ پر پیش نہیں کیا جتنی وہ منٹو کے افسانوں میں جھلکتی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کوئی دوسرا ادیب بمبئی کی عام روزمرہ کی زندگی میں اس طرح جذب نہیں ہو سکا جس طرح کہ منٹو۔ بائیکلہ اور ناگپاڑہ بمبئی کے وہ علاقے ہیں جس نے اردو ادب کو چند غیر فانی کردار اور لازوال ماحول دیا ہے۔ اس علاقے میں اردو اخباروں کے دفتر، عیسائیوں کے فلیٹ مسلمانوں اور یہودیوں کی چالیں، بھینسوں کے طویلے، کوچبانوں کے مکانات، گھوڑوں کے اصطبل، داداؤں کے اڈے،، ایرانی اور اسلامی ہوٹلیں، چینی ڈاکٹروں، یونانی حکیموں اور تعویذ گنڈے کرنے والے عاملوں کی دکانیں اور بمبئی کا سب سے بڑا قحبہ خانہ ہے۔ جنھیں منٹو نے نہایت خوش اسلوبی سے استعمال کر کے بمبئی کے مقامی رنگ کو نکھارا ہے۔ مسز ڈی کوسٹا مسز ڈی سلوا، ممکو کوچبان، سوگندھی، موذیل، ممد بھائی اور سینکڑوں اخبار بیچنے والے، پان والے باہر والے (ہوٹل کے ملازم لڑکے) قلعی والے اور عام لوگ جو اس ماحول کی پیداوار ہیں اور ادب کے ایسے آشنا کردار ہیں جنھیں زمانہ آسانی سے فراموش نہیں کر سکے گا۔

منٹو نے اس ماحول کو پوری واقعیت اور جزئیات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس نے اس ماحول کی گندگی کو اچھالا نہیں، بلکہ فنکارانہ مہارت کے ساتھ نہایت سلیقہ سے اسے ادب میں منتقل کیا ہے۔ اس نے اس گندگی پر ناک بھوؤں بھی نہیں چڑھائی۔ ایک مشاق ڈاکٹر کی طرح سماج کے اس پھوڑے پر اس نے عمل جراحی کیا ہے۔ نفاست پسند طبیعتیں اس گندگی کو برداشت نہیں کر سکیں۔ لیکن کیا کیا جائے ادب کا معاملہ ہی کچھ الٹا ہے۔ نہ جانے کیوں لوگ حسین مجسموں، شفاف باہوں اور تھرکتی ہوئی پنڈلیوں کو چھوڑ کر شکسپیئر کی کریہہ صورت چڑیلوں کو دیکھنے چلے جاتے ہیں۔ پتہ نہیں کیوں رومانی ڈرامہ کے حسین و جمیل ہیرو کو چھوڑ کر سیاہ فام آتھیلو کو دیکھنا پسند کرتے ہیں، نہ جانے کیا وجہ ہے کہ شوکت تھانوی اور رئیس احمد جعفری کے ناولوں کی شوخ و طرار چندے آفتاب چندے ماہتاب حسین اور پرکشش لڑکیاں ہمیں دس منٹ بھی متوجہ نہیں رکھ سکتیں۔ لیکن عصمت کی ساس، منٹو کی سوگندھی، بیدی کی کوکھ جلی ماں اپنی بدصورتی کے باوجود ہمیں محو رکھتی ہیں۔

طوائف پر لکھنا منٹو کی اولیت میں شامل نہیں۔ مرزا رسوا، پریم چند، قاضی عبدالغفار وغیرہ سے بھی یہ گناہ سرزد ہو چکا ہے لیکن جس خلوص اور حقیقت پسند طریقہ سے منٹو نے طوائف پر قلم اٹھایا ہے اس کے پہلے اور اس کے بعد اس طور سے کوئی لکھ نہ سکا۔ منٹو کے ذریعہ پہلی بار اردو ادب اس طوائف سے روشناس ہوا جس کے کوٹھوں پر لوگ آداب محفل سیکھنے کی بجائے بقول کالی شلوار کی سلطانہ کے جھک مارنے جایا کرتے ہیں۔ منٹو کی طوائف کو دیکھ کر نفرت کی بجائے ہمدردی اور لذت کے بجائے غم کا احساس ہوتا ہے۔ نوک قلم کی ایک ہلکی سی جنبش اور چند ہی اشاروں میں منٹو قحبہ خانہ کی تیرہ و تار، غلاظت اور گندگی میں لتھڑی ہوئی گھناؤنی فضا کو اس طرح پیش کر دیتا ہے کہ طوائف انسان کے بجائے بدرو کا ایک کیڑا نظر آنے لگتی ہے۔ اس کی زبوں حالی اور گراوٹ اس کا افلاس اور کچلی ہوئی شخصیت اخلاق اور زندگی کے اس نظام اقدار کے خلاف احتجاج کرتی ہے جو انسان کو اس قدر ذلیل زندگی گزارنے پر مجبور کرتا ہے۔ ڈرپوک میں مائی جیواں کا قحبہ خانہ۔ ہتک میں سوگندھی کی کھولی اور پہچان میں بیسواؤں کے تاریک گھروندے منٹو کی جزئیات نگاری، عمیق مشاہدہ اور قوت بیان کے کامیاب نتائج ہیں۔ منٹو کے مشاہدہ میں کس غضب کی گہرائی اور گیرائی تھی کہ معمولی سی چیز بھی اس کی عقابی نگاہ سے بچ کر نہیں جا سکتی تھی۔ منٹو نے جس بے باکی، سچائی اور حقیقت پسندی سے ان قحبہ خانوں کی تصویر کشی کی ہے اور ایک ایک تفصیل کو جس طرح سے ابھارا ہے اس کی تصویر زولا اور جیمس ٹی فیرل کے سوا کہیں اور نظر نہ آئے گی۔

منٹو کے یہاں طوائف کی مختلف شکلیں ملتی ہیں۔ سلطانہ، خوبھابائی اور محمودہ الیہ کردار ہیں۔ مستقیم محمودہ کو پہلی بار اپنی شادی میں دیکھتا ہے۔ اس وقت محمودہ نہایت شریف اور سنجیدہ لڑکی ہوتی ہے۔ اس کی آنکھیں کافی پُرکشش ہوتی ہیں۔ افسانہ میں محمودہ پس منظر میں رہتی ہے اور مستقیم، اس کی بیوی اور ہمسایوں کی گفتگو سے اس کا کردار ابھرتا رہتا ہے۔ محمودہ کی شادی بدقسمتی سے ایک ایسے شخص سے کردی جاتی ہے جو شادی کے قابل نہیں ہوتا۔ وہ اپنی اس نااہلیت کی پردہ پوشی کی خاطر درویشوں اور فقیروں میں گھومنا شروع کردیتا ہے۔ وظیفے پڑھتا ہے اور چلے کھینچتا ہے۔ آخری بار مستقیم محمودہ کو کراچی میں پان بیچتے اور لوگوں سے فحش مذاق کرتے دیکھتا ہے۔ اسے آواز آتی ہے۔ "ادھر آؤ دلہا میاں! تمہیں ایک فسٹ کلاس پان کھلائیں۔۔۔۔ ہم تمہاری شادی میں شریک تھے۔" محمودہ کی زندگی اور کردار کا یہ المناک موڑ فوری نہیں ہوتا۔ ایک بالطبع خاموش اور شریف لڑکی سے جسم فروش بننے تک محمودہ مختلف منازل طے کرتی ہے۔ وہ حالات جو خود اس کے پیدا کردہ نہیں تھے اُسے ایک غیر فطری زندگی گزارنے پر مجبور کرتے ہیں۔

خوبھابائی (شوبھابائی) بظاہر ایک بیوہ ہے لیکن اپنے بدکار جسم میں نہایت ہی پاکیزہ دل رکھتی ہے۔ اس میں ماتا کا جذبہ بہت شدید ہے۔ وہ اپنے لڑکے سے بے پناہ محبت کرتی ہے۔ جسم کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔ وہ تو ایک جنسی تجارت ہے جو کسی کے بھی ہاتھوں بیچا جاسکتا ہے۔ لیکن اس کا دل اس کا اپنا ہے جس میں سوائے اپنے لڑکے کی محبت کے کسی اور چیز کی سمائی نہیں۔ لڑکے کی موت اُس کی زندگی پر آخری ضرب ثابت ہوتی ہے۔ وہ ایک کانچ کے برتن کی طرح ٹوٹ جاتی ہے۔ پاگلوں کی طرح الجھے ہوئے بال غلیظ کپڑے اور دہشت زدہ صورت لئے وہ راستوں پر بھیک مانگتی نظر آتی ہے۔

ممی پرانی نائکاؤں کی جدید شکل ہے۔ اُس کے گھر میں قحبہ خانہ کی بجائے ایک گھریلو فضا مسلط رہتی ہے۔ جس میں ممی کی حیثیت ایک ماں کی ہوتی ہے جو اپنے بچوں کے لئے دلچسپ کھلونے لاتی ہو۔ جوان بچوں کے لئے جوان کھلونے۔ سعیدہ کالج کے ناکام نامراد اور دل شکستہ باسیوں کے لئے جو فلمی دنیا میں اپنا راستہ بنانے کے لئے جدوجہد کررہے تھے۔ جو اپنے گھر، اپنے دوستوں اور اپنے رفیقوں سے دور تھے۔ ان کے لئے جن کا اس غریب الوطنی میں کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ ممی واقعی ایک ماں کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ ان کی دل بستگی کا سامان مہیا کرتی ہے۔ آڑے وقت میں ان کے کام آتی ہے۔ بیماری میں تیمارداری کرتی ہے۔ غم واندوہ کے وقت انھیں دلاسا دیتی ہے۔ ان کی ڈھارس بندھاتی ہے اور جب دل پر نا امیدی اور نراشا کی گھٹائیں چھانے لگتی ہیں تو وہ ان کی امید اور حوصلہ بڑھاتی ہے زمانہ کی نظروں میں صرف وہ ایک دلالہ ہے۔ لیکن زمانہ اس کی روح کی پاکیزگی، اس کی شفقت، شرافت اور انسانیت اور اس کا پرخلوص دل نہیں دیکھ سکتا۔"

طوائف کے موضوع پر ہتک منٹو کا سب سے جاندار افسانہ ہے۔ اگر یہ کہیں کہ اس موضوع پر ہتک حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے تو شاید مبالغہ نہ ہوگا۔ یہ افسانہ تمام فطرت پسندوں، زولا اور موپاساں سے لے کر جیمس ٹی فیرل تک کی بہترین تخلیقات کے ہم پایہ ہے۔ پتہ نہیں سردار جعفری نے کیوں اسے سو فیصدی رجعت پسند اور انحطاطی کہا ہے۔ کرشن چندر تو اس کی تعریف میں اس قدر رطب اللساں ہیں کہ "میں نے روسی شاہکار یاما بھی پڑھا ہے اور اسی موضوع پر کئی ایک فرانسیسی کہانیاں بھی پڑھی ہیں اور امراؤ جان ادا کے کردار کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ لیکن ہتک کی ہیروئن کی ٹکر کا ایک کردار بھی مجھے ان ناولوں اور افسانوں میں نظر نہیں آیا۔" سوگندھی سماج کا بہت ہی کچلا ہوا کردار ہے اس کی مظلومیت کا دل میں غم وغصہ کے جذبات پیدا کرتی ہے۔ طوائف کا بڑھاپا بہت ہی سبک رفتار ہوتا ہے۔ سوگندھی کے کانوں میں اس کی دھمک پہنچ رہی ہے۔ کاروالے بابو کی ایک 'اونہہ' اس میں وہی ہیجان اور انتشار پیدا کردیتی ہے جو کیشو لال کے دماغ میں سینٹھ کی دو گالیاں کھا کر پیدا ہوا تھا۔ وہ غصہ میں آکر مادھو کی اور دوسرے لوگوں کی تصویریں پھینک دیتی ہے اور مادھو کو گھر سے باہر نکال دیتی ہے۔ افسانہ نقطۂ عروج پر اس وقت پہنچتا ہے جب اداس اور غمزدہ سوگندھی تنہا اور اکیلی رہ جاتی ہے اور کوئی اس کا پرسان حال اور غم گسار نہیں ہوتا جس کے سامنے وہ اپنا دکھ درد بیان کرسکے۔ اسے چاروں طرف ایک ہولناک سناٹا دکھائی دیتا ہے۔ "ایسا سناٹا جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اسے ایسا لگا کہ ہر شے خالی ہے۔ جیسے مسافروں سے لدی ہوئی ریل گاڑی سب اسٹیشنوں پر مسافر اتار کر اب لوہے کے شیڈ میں بالکل اکیلی کھڑی ہے۔" اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ وہ اس خلا کو جو اس کے اندر ہی اندر پھیلتا جارہا تھا کس طرح سے پُر کرے۔ بالآخر اُسے جب اپنا دل بہلانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اپنے خارش زدہ کتے کو پہلو میں لے کر ساگوان کے چوڑے پلنگ پر سوگئی۔

بعض نقادوں کا خیال ہے کہ افسانہ کا انجام غیر انسانی اور کلبیت لئے ہوئے ہے، لیکن یہ حقیقت ہے۔ افسانہ کا انجام افسانہ کی مجموعی ساخت، واقعیت اور نفسیاتی ارتقاء سے ہم آہنگ ہے۔ جس طرح سے افسانہ کی نشو ونما ہوئی ہے اور جس ڈھنگ سے ایک مخصوص قسم کے حالات میں ایک مخصوص کردار کو پیش کیا گیا ہے اور مخصوص واقعات اور حقائق کو ابھارا گیا ہے۔ اس کے پیش نظر ضروری تھا کہ افسانہ کو اپنے فطری انجام تک پہنچایا جائے اور غلط قسم کی انسانیت پرستی کو راہ دے کر آرٹ حقیقت اور زندگی تینوں کا خون نہ کیا جائے۔

ریاکاری، جھوٹ اور سفلہ پن کے خلاف منٹو نے جو آواز بلند کی اور سچائی خلوص اور انسانیت کے درخشاں جواہر پاروں کو جس طرح اس نے ٹھکرائی ہوئی زندگی کی غلاظت میں بھی دیکھ لیا وہ عام مشرقی روایات سے کچھ علاحدہ چیز نہیں ہے۔ حافظ اور خیام سے لے کر جوش تک سبھی نے ریاکار زاہدوں اور شب زندہ دار بزرگوں کے مقابلہ میں اس رِند بادہ کش اور رند خانہ خراب کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا جن کے ظاہر و باطن میں کوئی بعد نہیں تھا جو سے خوری کرتے تھے لیکن قرآن کو دامِ تزویر نہیں بناتے تھے۔ جو 'خونِ ارزاں' پیتے تھے 'خونِ کساں' نہیں پیتے تھے۔ وہ ان ریاکار لوگوں کی مانند نہیں تھے جو خیام کے الفاظ میں شراب نہیں پیتے تھے لیکن سیکڑوں ایسے کام کرتے تھے جن کے سامنے شراب ایک ادنیٰ غلام کی حیثیت رکھتی ہے۔ جانکی بدکردار اور بد اخلاق سہی، لیکن اس کے دل میں خلوص ہے، انسانیت ہے۔ وہ جسم کی بُری سہی لیکن دل کی بُری نہیں۔ لتیکا رانی اپنے خوب صورت جسم میں نہایت ہی کینہ دل رکھتی ہے۔ انسان کا اس کے دل میں کوئی احترام نہیں۔ زندگی کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ اس کا سماجی مقام جانکی سے بلند ہے لیکن جہاں تک انسانیت، محبت اور ہمدردی کے جذبات کا تعلق ہے جانکی کی روحانی عظمت کے سامنے وہ ایک حقیر ذرہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ جانکی دوسروں کی خدمت گزاری آرام اور آسائشوں کے لئے اپنی زندگی تک کی پروا نہیں کرتی لتیکا رانی خود غرضی اور خود غرضی کی خاطر دوسروں کی زندگی کو ٹھکراتی ہے۔ انسانوں کی زندگی کی حرارت چھین لیتی ہے۔ بابو گوپی ناتھ سماجی طور پر سعید اور راج کشور سے زیادہ گرا ہوا انسان ہے لیکن اس کی ایثار نفسی سعید اور راج کشور کے مقابلہ میں اسے زیادہ قابل احترام جگہ عنایت کرتی ہے وہ جس سے محبت کرتا ہے اُسے برباد نہیں کرتا۔ وہ بڑے خلوص سے اپنی محبوبہ زینت کی شادی کردیتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جب اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہوگا تو زینت کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہے گا اور وہ لوگ جو اس کے گرد جونکوں کی مانند لگے ہوئے ہیں زینت کو دلہن بناتا ہے اور اس کی شادی رچاتا ہے وہ اپنی محبت کی

امانت کو محفوظ ہاتھوں میں جاتے دیکھ کر کس قدر خوش ہوتا ہے۔ اس موقع پر اس کی روح کی پاکیزگی اور طہارت اور بھی نکھر جاتی ہے۔

ان افسانوں میں منٹو کی رجائیت ایک اثباتی قدر کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ انسان اور انسان کی زندگی کا احترام دوسری تمام چیزوں سے مقدم ٹھہرتا ہے۔ ان اخلاقی قدروں سے بھی جو فرسودہ ہو چکی ہیں لیکن جن سے آج کا انسان مکمل طور پر قطع تعلق نہیں کر سکا اور جو اس کی فطری پاکیزگی کے اظہار میں سنگ گراں بنی ہوئی ہیں، روایاتی اخلاقی اور سماجی قدروں کے خلاف بغاوت اور ذہنی انقلاب بہت مشکل سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ قدریں جو انسان کے شعور میں رچی ہوئی ہیں اور جن سے اس کی سماجی شخصیت کا خمیر اٹھا ہے، آسانی سے نہیں چھوڑی جا سکتیں۔ "جاؤ حنیف جاؤ" میں حنیف عورت کی پاکیزگی اور عصمت کے متعلق ان آبائی تصورات سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا جو ورثا اسے ملے ہیں۔ سمتری کی اپنے آوارہ بہنوئی کے ہاتھوں عصمت ریزی کے بعد حنیف اپنی شدید محبت کے باوجود اسے قبول نہیں کرتا اور سمتری کی زبان سے نکلے ہوئے ان تین دکھ بھرے لفظوں "جاؤ حنیف جاؤ" کو سن کر وہ ٹھہر نہیں جاتا بلکہ واقعی چلا جاتا ہے۔ حنیف کو اپنے اس اقدام کا دکھ ہے۔ وہ اپنی کمزوری کا اعتراف کرتا ہے۔ "مرد عموماً ایسے معاملوں میں کمزور ہوتا ہے۔" وہ خود پر لعنت ملامت بھی کرتا ہے۔ یہ بھی اطمینان بخش بات ہے کہ کچھ نہیں تو اس کے ضمیر کی آواز تو زندہ ہے۔ اسے اپنی کمزوری کا احساس تو ہے، کیا ہوا جو وہ اس بلندی پر نہیں پہنچ سکتا۔ جہاں باسط پہنچا ہوا ہے۔ اور فی الحقیقت ایسے کتنے لوگ ہمیں ملتے ہیں جو باسط کی عظمت کے حامل ہیں۔

باسط تو بالکل ایک اور ہی کردار معلوم ہوتا ہے۔ شریف، مخلص اور خاموش طبع، باسط انسانی ہمدردی کی ان اعلیٰ صفات کو اپنے دل میں سموئے ہوئے ہے۔ جن کا تصور بھی وہ لوگ نہیں کر سکتے جو روایاتی انداز فکر اور ملمع شدہ جھوٹی اخلاقی قدروں کے شکنجے میں محبوس ہیں۔ باسط ذہین ہے، لیکن مفکر یا دانشور نہیں۔ وہ کسی طویل فلسفیانہ سلسلۂ فکر کے ذریعہ اس نتیجہ پر وہ نہیں پہنچتا کہ عصمت سے زیادہ قابل احترام چیز انسان کی زندگی ہے، اپنی بیوی سعیدہ کی زندگی سعیدہ نے پہلے گناہ سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ سعیدہ کی تکالیف اور کربناک حالت کو دیکھ کر اس کا دل رحم اور ہمدردی کے جذبات سے بھر جاتا ہے اور وہ اس غلطی کو معاف کر دیتا ہے۔ جسے اردو کے افسانوی ادب کا کوئی کردار معاف نہیں کر سکا۔ باسط بوہیمین باغی یا انقلابی نہیں ہے۔ اسی لئے اس کا یہ اقدام باغیانہ نہیں ہے، وہ سعیدہ کی غلطی کو معاف کر کے سماج سے بغاوت نہیں کرتا، باغی مروجہ اخلاقی قدروں سے اپنا رشتہ توڑ دیتا ہے۔ اور اس طرح وہ محض اپنی بغاوت کے بل بوتہ پر ہر کام کو آسانی اور آزاری سے کر سکتا ہے، سماجی احتساب اور نکتہ چینیوں کی پروا کئے بغیر وہ ہر اس کام کو نہایت اطمینان سے کرتا رہتا ہے جو سماج کی نگاہوں میں معیوب ہو۔ اس کی بغاوت یا بوہیمیا ازم نے اس کے ہر آنے والے اقدام کے لئے میدان ہموار کر دیا ہوتا ہے۔ کرشن چندر کا بھگت رام۔ ایک ایسا ہی شخص ہے جو ایک ٹھکرائی ہوئی عورت کو گھر میں ڈال لیتا ہے جو مسجد میں اذان دینے چلا جاتا ہے۔ لیکن باسط اگر باغی یا انقلابی ہوتا تو اس کا کردار وہ رعنائی اور جاذبیت کھو بیٹھتا جو اسے حاصل ہے، اگر وہ غیر معمولی آدمی ہوتا تو اس کا اقدام کوئی معنویت اور کشش پیدا نہ کر سکتا۔ افسانہ کی تمام تر خوبی کا راز اسی میں ہے کہ ایک عام قسم کے معمولی انسان سے ایک غیر معمولی کام سرزد ہوتا ہے۔ وہ بات جو انسانیت اور زندگی پر فلسفیانہ خیال آرائی کرنے والوں کو بھی حواس باختہ کر سکتی تھی باسط کے لئے ایک معمولی بات بن جاتی ہے۔ اگر باسط انقلابی، باغی یا دانشور ہوتا تو اس کے اس انسانی عمل میں وہ بے ساختگی نہ ہوتی جس کی وجہ سے اس کا عمل ایک خودرو پھول کی رعنائی اور پاکیزگی لئے ہوئے ہے۔ وہ سعیدہ کے گناہ کو معاف کر دیتا ہے۔ معاف ہی نہیں کرتا بلکہ اس کی پردہ پوشی اور اس سے چشم پوشی کرتا ہے۔ وہ سعیدہ کے متعلق سوچتا ہے کہ اس نے نہ جانے کتنی تکالیف اٹھائی ہیں۔ کس قدر کربناک اذیتوں سے گزری ہے اور اسی کے ساتھ اس کے دل میں ہمدردی کا ایک بے پناہ جذبہ ابھر آتا ہے۔ وہ فطری طور پر حساس اور پر خلوص انسان ہے۔ وہ سب کچھ بھول جاتا ہے۔ وہ سعیدہ کو معاف کر دیتا ہے۔ پیغمبرانہ طریقہ پر نہیں۔ خالص انسانی طریقہ پر۔ باسط میں منٹو کی اڑان بہت اونچی ہے۔ اتنی اونچی کہ اوروں کا تو کیا ذکر خود منٹو اپنے بہت کم افسانوں میں اتنی بلندی پر پرواز کر سکا ہے۔ ●

بقیہ صفحہ ۲۵ سعادت حسن منٹو

منٹو فطری طور پر مستقل مزاج اور حوصلہ مند انسان تھا اس پر بڑی کڑوی اور سخت تنقیدیں ہوئیں مگر وہ متاثر نہ ہوتا اس کی وجہ یہ تھی کہ اسے اپنے فن پر بھروسہ تھا اس کا ادبی نظریہ اس کی انفرادیت پرستی اور عجیب و غریب افتاد مزاج کا رہین منت تھا اسی لئے وہ کسی کی بات نہیں مانتا تھا جو لوگ اس کے افسانوں کو ناپسند کرتے تھے ان سے وہ پوری بے باکی کے ساتھ کہہ دیتا تھا:

"یہ زمانہ ہی ناقابل پسند ہے۔"

بعض تنقید نگاروں نے اسے سیاہ قلم کہا تو اس نے صاف طور پر جواب دیا "آپ لوگ مجھے سیاہ قلم کہتے ہیں لیکن میں تختہ سیاہ پر کالی چاک سے نہیں لکھتا سفید چاک استعمال کرتا ہوں کہ تختہ سیاہ کی سیاہی اور بھی نمایاں ہو جائے۔" زندگی کے متعلق منٹو کا نظریہ بہت صاف اور واضح تھا وہ کہتا ہے "مجھے زندگی سے پیار ہے حرکت کا دلدادہ ہوں۔ چلتے پھرتے سینہ پر گولی کھا سکتا ہوں لیکن جیل میں کھٹمل کی موت مرنا نہیں چاہتا۔"

منٹو کے رجحان اور شعور کے بارے میں کوئی قطعی رائے قائم کرنا دشوار نہیں۔ اس نے اتنے افسانے لکھے ہیں جن سے اس کی انفرادیت واضح ہو گئی ہے اسی میں اس کا اصل رجحان پوشیدہ ہے۔ وہ ہنری اور ڈی ایچ لارنس سے کافی متاثر تھا، آخر میں چچا سام کے نام جو خطوط لکھے ہیں ان میں طنزیہ حقیقت نگاری کی نہایت عمدہ مثالیں ملتی ہیں اور اس کی انفرادیت مکمل کر سامنے آجاتی ہے۔ ان خطوط میں اس کا طرز نگارش نہایت دلچسپ اور بھرپور ہے۔ طنز میں بڑی فن کاری اور خوب صورتی ہے لیکن لکھنے کا ڈھنگ بہت سادہ اور معصومانہ ہے۔ پانچویں خط میں ایک جگہ کس سادگی سے لکھتا ہے: "چچا جان! میں آپ سے پوچھتا ہوں، آپ اپنے یہاں نبی کیوں پیدا نہیں ہونے دیتے۔ خدا کی قسم ایک پیدا کر لیجئے بڑی تفریح رہے گی بڑھاپے میں وہ آپ کی لاٹھی کا کام دے گا اس لاٹھی سے آپ امریکہ کی ساری بھینسیں ہانک سکیں گے۔"

انداز بیان کی اس سادگی میں گہرا طنز چھپا ہوا ہے اس کی گہرائی تک پہونچنے کے لئے یہ جملہ ضرور پڑھ لینا چاہیے جو اسی خط میں چند سطر پہلے لکھا جا چکا ہے۔ "یہاں نبی پیدا ہوتے ہیں وہاں نہیں ہوتے یہاں ان کے ماننے والے وزیر خارجہ بنتے ہیں اس پر ملک میں ہنگامے برپا ہوتے ہیں مگر کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔"

اسی خط کے آخر میں اپنے ملک کی معاشی بدحالی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ "یہ سمجھ لیجئے کہ بدن پر لتے جھولنے کا زمانہ آگیا ہے، کپڑا اتنا مہنگا ہو گیا ہے کہ جو غریب ہیں ان کو مرنے پر کفن بھی نہیں ملتا اور جو زندہ ہیں وہ تار تار لباس میں نظر آتے ہیں میں نے تو تنگ آکر سوچا ہے کہ ایک ننگا کلب کھول دوں لیکن سوچتا ہوں ننگے کھائیں گے کیا؟"

آخر میں منٹو کا فن بکنے لگا تھا وہ مجبور ہو کر پیسوں کے لئے لکھنے لگا تھا جس رسالہ کے ایڈیٹر نے اس کی جیب میں پچیس روپے ڈال دیئے منٹو نے اس کے لئے ایک افسانہ لکھ دیا مگر ایسے افسانوں میں بھی منٹو کی انفرادیت جھلکتی ہے۔ تاثیر اور دلچسپی کہیں فنا نہیں ہوتی اور پڑھنے والا بے چینی کے ساتھ اختتام تک پہنچنے کی کوشش میں منہمک رہتا ہے۔ ●

کوثر چاند پوری

سعادت حسن منٹو

مارچ ۱۹۵۴ء کی ۲۹ رتاریخ کو جب میں تقسیم کے بعد پہلی مرتبہ لاہور گیا اور اسٹیشن کے قریب بس سے اتر کر تانگہ میں سوار ہوا تو سب سے پہلے ایک بگولہ ناچتا تھرکتا سر پر سے گزر گیا۔ اس سے قبل میں یہاں آیا تھا تو میں نے رنگ برنگے آنچل ہوا میں لہراتے دیکھے تھے، سیاہ چوٹیاں شانوں پر جھومتی دیکھی تھیں۔ رنگین شلواروں کے پھولے ہوئے پائنچے دیکھے تھے اور انارکلی اور نسبت روڈ پر لڑکیوں کے غول دیکھے تھے جنہیں دیکھ کر تتلیوں کا گمان ہوتا تھا اور سڑک پر دھنک کمان بنی نظر آتی تھی لیکن ۲۹ر مارچ کی ہلکی گرم دوپہر کو صرف یہ بے چین بگولہ ہی فضا میں کروٹیں لیتا دکھائی دیا۔ شاید وہ مجھ سے کہنا چاہتا ہو کوثر صاحب اب ان لہراتے آنچلوں کو بھول جاؤ کالی چوٹیوں اور رنگین شلواروں کو بھی بھول جاؤ، انارکلی اور نسبت روڈ پر اڑتی ہوئی تتلیاں بھی اب نظر نہ آئیں گی اس وقت تو تمہیں چند دریدہ میلے برقعوں کا نظارہ ہی کرنا ہوگا اور سڑک پر ٹوٹے سلیپر گھسیٹ کر چلنے والی ان خزاں رسیدہ جوانیوں کو دیکھنا ہوگا جن کی لٹکتی ہوئی چھاتیوں میں دودھ کی نہریں سوکھ چکی ہیں اور آنکھوں میں کی چمک ماند پڑ گئی ہے ان میں کوئی راجستھان کی ہے کوئی مہاراشٹر کی اور ان کے سوکھے بے رونق رخساروں پر ان کے گھروں کی یادیں بس رہی ہیں، کسی کے گالوں پر جلیانوالہ کی تاریخ رو رہی ہے، کسی کی آنکھ سے پھولوں والے میلے کی رنگ رلیاں آنسو بن کر بہہ رہی ہیں اور کسی کے لبوں پر تاج محل کا سفید مرمریں حسن منجمد ہو کر رہ گیا ہے اور جیسے ہی تانگہ والے نے گھوڑے کی کمر پر چابک مار کر اسے آگے بڑھایا، پھٹے ہوئے برقعوں کی کئی متحرک قطاریں مجھے نظر آئیں ان کی ہیئت ایک ایسے واسوخت کا منظر پیش کر رہی تھی جس کے مصنف کا نام بھی وہ نہ جانتی تھیں لیکن میں تو اسے جانتا تھا۔ میں نے سعادت حسن منٹو سے اس کا ذکر سنا تھا اور اس کی بعض کہانیوں میں اس کے نقش و نگار دیکھے تھے ان برقعوں کو دیکھتے ہی مجھے سعادت حسن منٹو کی یاد آئی۔ بہت دن پہلے میں دہلی میں اس سے ملا تھا اور اس نے ہاتھ ملانے کے دوران میں اپنے پتلے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر کر کہا تھا، آپ کی وہ کتاب تو بڑی خوبصورت ہے کیا نام ہے اس کا۔۔۔ خیر کچھ ہوگا۔ میں نے اس کا ایک مضمون ''پان'' پڑھا ہے۔ اور پھر کافی دن گزر جانے کے بعد ملک دو حصوں میں بٹ گیا، رنگین شلواروں کے پائنچے پھٹ گئے اور برقعوں میں میل جم گیا، کالی چوٹیاں اس طرح سمٹ گئیں جیسے جھومتے لہراتے ناگ پٹاریوں میں بند ہو جاتے ہیں اور سعادت حسن منٹو اپنے اجلے رنگ، چھریرے جسم اور چمکیلی آنکھوں کے ساتھ میرے دماغ پر چھا رہ گیا، اس درمیان میں اس کے بہت سے افسانے پڑھے، کتابیں دیکھیں دو چار فوٹو بھی نظر سے گزرے مگر منٹو سے ملاقات نہ ہو سکی، وہ بمبئی چھوڑ کر لاہور جا چکا تھا شام کو میں اس کی جگمگاتی اور گنگناتی ہیرا منڈی سے گزرا جہاں سے منٹو نے نہ جانے کتنی کہانیوں کے پلاٹ سمیٹے ہیں اور نہ جانے کتنے افسانوں کے کردار اور موضوع پکڑ کر قید کئے ہیں۔ جس عصمت فروش کو بھی میں نے کسی دو منزلہ سے جھانکتے دیکھا منٹو کا کوئی نہ کوئی کردار ذہن میں گھوم گیا، سمجھا الماس یہی ہوگی اور اگر وہ نہیں تو اس کی ماں اقبال ضرور ہے، جس سے صلاحو نے الماس کے پردے میں معنوی عشق کیا تھا اور جب ایک پہلوان تہمد باندھے، ڈھیلا کرتہ پہنے جھومتا جھامتا میرے پاس سے گزرا تو بے اختیار مجھے وہ پہلوان یاد آ گیا۔ صلاحو اور بابو کا پرستار دودے جس کے بھرے ہوئے خوبصورت جسم کی دلکش رعنائیوں نے ہیرا منڈی کی حسین و جمیل الماس کی سرکش جوانی کو جھکا کر اس سے صلاحو کے لئے دس ہزار وصول کر لئے تھے اور اس رقم میں اپنے لنگوٹ کا اس کی تھنی سے سودا کر لیا تھا۔ اگلے دن کے پروگرام میں سب سے پہلے سعادت حسن منٹو کا نام تھا میں اس کے گھر جا کر اس سے ملنا چاہتا تھا اور اس سے ان گھریلو چوریوں کی تفصیل معلوم کرنے کا مشتاق تھا جن سے اس کی بیگم ہمیشہ ڈرا کرتی تھی مجھے معلوم تھا سعادت حسن منٹو بڑا چالاک ہے، وہ اپنی بیگم کو پانچ سو کے نوٹ دے کر ان میں سے سو روپے چرا لیتا ہے۔ منٹو کے گھر جانے کے لئے میں ایک تانگہ میں بیٹھ گیا لیکن دو گھنٹے تک ادھر اُدھر گھمانے کے بعد بھی وہ مجھے منٹو کے مکان تک نہ پہنچا سکا اور میں ہاری در واز ے میں [illegible] ''سویرا'' کے دفتر میں چلا گیا وہاں چودھری نذیر احمد سے ملاقات ہوئی جو میری دو کتابوں کے ناشر ہیں۔ پھر ان کے چھوٹے بھائی چودھری بشیر سے ملا وہ ایم اے کرنے کے بعد اب سویرا نکال رہے ہیں۔ وہیں اختصار حسین کو دیکھا اور ذرا دیر بعد ایک دم منٹو بھی وہاں آ گیا سر ننگے، خشک مگر سنورے ہوئے بال، مرچ کی شیروانی کے اوپر کے چند بٹن کھلے ہوئے اور مسکراتی مگر جھکی آنکھوں میں چمکدار عینک، جسم دہلی جیسا چھریرا نہ بہت بھاری، چہرے کا حسن کچھ نکھرا ہوا۔ اس پر کشمیر کی وادیوں کے پھول کھلے ہوئے، سوکھے ہونٹوں پر ہلکی سی سرخی، چودھری نذیر احمد نے تعارف کرایا اور منٹو نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر خوب دبایا، اس کے ذہن میں پہلی ملاقات کے نقوش ابھر رہے تھے۔

میں خوب جانتا ہوں، خوب جانتا ہوں، بڑی خوشی ہوئی، پھر وہ اخباروں کے ڈھیر پر بیٹھ گیا۔ چودھری صاحب کہتے رہے۔ 'یہاں آئیے، یہاں آئیے۔'

بس ٹھیک ہوں، بالکل ٹھیک ہوں۔ اس نے ہاتھ نچا کر کہا وہ کسی اور ہی عالم میں تھا۔ ذرا دیر بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور چودھری نذیر احمد کو اشارہ سے الگ لے گیا اور پھر سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

چودھری صاحب نے بتایا، کچھ پیسوں کی ضرورت تھی میاں کو!

منٹو چلا گیا مگر اپنا ذکر چھوڑ گیا، میں نے اندازہ لگایا کہ منٹو کسی عالم میں بھی ہو لوگ اس کی عزت کرتے ہیں۔ دل میں اس کا احترام ہے۔ دیر تک منٹو کے فن پر بات چیت ہوتی رہی سب ہی اس کی فن کاری کے معترف تھے، مجھ سے بھی منٹو کے آرٹ کے بارے میں پوچھا گیا اور میں نے اپنے خیالات ظاہر کئے۔ میرے نزدیک وہ عظیم فن کار تھا اس کے افسانوں میں گہری دلچسپی، تاثیر اور واقعیت کے ساتھ بھی ایک عجیب قسم کا رچاؤ ہوتا تھا میں جب بھی اس کی کوئی کہانی پڑھتا ایسا محسوس ہوتا کہ شدید پیاس کے وقت کوئی ٹھنڈا میٹھا شربت پی رہا ہوں جس نے

پھولوں کی بھینی بھینی مہک بھی آرہی ہے اور رگوں میں سلگتی ہوئی چنگاریاں بھی ٹھنڈی ہوتی جارہی ہیں اس شربت میں جو چیزیں گھلی ہوئی تھیں ان کا پتہ بعد میں چلتا تھا لیکن اس کی تاثیر پہلے محسوس ہو جاتی تھی۔ میں نے منٹو کا پورا پتہ نوٹ کیا اور کراچی سے واپسی میں اس سے ملنے کا ارادہ کرکے اسی دن پاکستان میل سے کراچی چلا گیا۔ پھر لوٹتے وقت میں منٹو سے نہ مل سکا یہ معلوم بھی نہ تھا کہ وہ اسی سال مرجائے گا۔ اسے دیکھ کر یہی محسوس ہوتا تھا کہ ہمیشہ زندہ رہے گا اور یقیناً مرنے کے بعد بھی سعادت حسن منٹو اپنے آرٹ کی صورت میں زندہ ہے، وہ مرسکتا ہے اس کے افسانے اور افسانوں کے جیتے جاگتے کردار کبھی نہیں مرسکتے، وہ اپنی انفرادیت میں بھی ہماری اجتماعی زندگی کے عکاس اور عوامی ادب کے مستقل نمائندے ہیں، موت کبھی ان کا گلا نہیں گھونٹ سکتی، اگرچہ میں منٹو سے دوبارہ نہ مل سکا لیکن میرے دل و دماغ پر اس مختصری ملاقات کا بہت گہرا نقش قائم رہا جواب تک موجود ہے میں نہیں بتا سکتا کہ منٹو میں خط و خال میں جمالیاتی نقطۂ نظر سے کیا خصوصیات تھیں مگر یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ مجموعی حیثیت سے اس کی شخصیت میں غضب کی کشش تھی اس کی رگوں میں خون کے ساتھ مقناطیس کے ذرے ناچتے تھے اور دل کو خاموشی سے اپنی طرف کھینچتے رہتے تھے اس کی آنکھوں کا بھی یہی عالم تھا عینک کے پیچھے چمکتی ہوئی کالی آنکھوں سے کرنیں سی نکلتی محسوس ہوتی تھیں۔ اور لمبوترے چہرے میں حسن کی سطح اس میں گھلا ہوا تیکھا پن نظر آتا تھا جس کی ہلکی تلخی کا احساس کرنے کے باوجود بھی اسے سنگدلی، بے دردی یا کسی ایسے ہی اور نام سے نہیں پکارا جاسکتا۔ اسی تیکھے پن کے جھروکوں سے اس کی بے باک فطرت جھانکتی تھی۔ جس میں انسانیت کا بے پناہ لوچ تھا، منٹو کی لمبی انگلیوں میں ایک ماہر جراح کی انگلیوں کا ساز ور تھا وہ نشتر کی جگہ قلم اپنی چٹکیوں میں تھام کر انسان کی سیرت پر بڑے بڑے آپریشن کرسکتا تھا، وہ بہت نڈر اور بہادر قسم کا افسانہ نگار تھا وہ حقیقت پسند بھی تھا اور حقیقت نگار بھی، زندگی کو جس روپ میں دیکھتا تھا اسی میں دوسروں کو دکھا دیتا تھا۔ بولتے وقت بھی وہ بہت صاف گو اور منہ پھٹ تھا۔ اور کہانیوں میں بھی اس کا قلم اس کی زبان کا ترجمان ہوتا تھا وہ صرف دشمنوں ہی کو نہ تاکتا تھا بلکہ دوستوں پر بھی بھرپور وار کرتا تھا اس کے جملوں سے احباب کے سینے بھی فگار رہتے تھے وہ دوستی اور دشمنی کے جذبات کو احساس سے جھٹک کر لکھنے کا عادی تھا اور یہی اس کے حقیقت پسند اور حقیقت نگار ہونے کی علامت ہے۔ منٹو کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ وہ جسموں سے خول اتار کر انہیں بالکل ننگا کردیا کرتا تھا اور جب وہ ننگے ہوجاتے تو زخم اور ناسور صاف نظر آنے لگتے، جن کو دیکھ کر ان جسموں میں چھپے ہوئے انسان چیخ اٹھتے، وہ منٹو کو گالیاں دینے لگتے، کوئی اسے فحش نگار کہنے لگتا کوئی جنس کے پاگل پن کا شکار، درحقیقت وہ نہ تو بالکل فحش نگار تھا نہ قطعی پاگل، وہ اپنے فن کو ابھارنے کے لئے ٹیکنیک کے طور پر عریانی کا سہارا ضرور لیتا تھا اور ایسا کرنے پر وہ مجبور تھا، کیونکہ منٹو حقیقت نگار تھا اور عریاں نگاری حقیقت نگاری ہی کی ایک ٹیکنیک ہے جس سے خاص موقعوں پر تصویر کو قطعی عریاں کردیا جاتا ہے اگر یہی عریاں نگاری مقصد بن جاتی ہے اور فنکار کو گندگی میں لذت محسوس ہونے لگتی ہے تو پھر وہ فحش نگار بن جاتا ہے۔ منٹو نے ایسی کہانیاں بھی لکھی ہیں جن میں حقیقت نگاری کے جوش میں وہ بھول گیا ہے کہ اس کی بیان کردہ حقیقتوں کو زندگی کو دوسری بڑھتی اور پھیلتی ہوئی طاقتوں سے کس حد تک تعلق ہے۔ یہ وہی کہانیاں ہیں جن میں اس نے سرمایہ داری نظام کے کسی انفرادی مظہر کو اس کے متعلقات اور لوازم سے الگ کرلیا ہے، ایسی کہانیاں ترقی پسندی کے اصل رجحان اور تصور پر ایک شدید چوٹ کا حکم رکھتی ہیں۔ لیکن صرف اس بنیاد پر منٹو کو فحش نگار نہیں کہا جاسکتا، نہ اس کا شمار رجعت پرستوں میں کیا جاسکتا ہے۔ یہ اس کے فن کا ایک موڑ ضرور ہے جو گندی نالیوں سے ملا ہوا ہے لیکن ایسے موڑ اس کے راستہ میں بہت زیادہ نہیں آئے، وہ بہک کر بھی سنبھل جانے کا ہوش رکھتا ہے، اگر کہیں اس کا نشتر گہرا لگ گیا ہے اور اس کی نوک صحت مند حصہ میں چبھ گئی ہے تو خود اس کے منہ سے بھی ہلکی سی آہ نکل گئی ہے اس کے باوجود یہ حقیقت تسلیم ہی کرلینی چاہیے کہ منٹو کا ذہن ہر طرف سے جنس کے دھندلکوں میں گھرا ہوا ہے اگرچہ اس کے یہاں قابل قدر صحت کے نمونے بھی موجود ہیں مگر مجموعی حیثیت سے اس کے روحانی رجحان کو مریضانہ ہی کہا جائے گا اس کی جنس پرستی میں بھی یہی بیماری موجود ہے، منٹو نے ادب کو سائنس کے نقطۂ نظر سے نہیں دیکھا پھر بھی وہ ایک ترقی پسند افسانہ نگار تھا اس نے ہمیشہ اسی تصور کو پیش کیا ہے۔ منٹو پر جدید ادب، ترقی پسند ادب اور فحش ادب کو خلط ملط کردینے کا الزام لگایا گیا ہے پھر بھی اس کی یہ خصوصیت نظر انداز نہیں کی جاسکے گی کہ اس نے ترقی پسند ادب کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں لکھا، اس معاملہ میں اس کی زبان بھی قلم سے پوری ہمنوائی کی ہے۔ سیاہ حاشیے پر عسکری سے دیباچہ لکھوا کر اس نے ایک غلطی ضرور کی ہے اور اس کتاب کا رجحان بھی اس کی دوسری تصانیف کے رجحان سے مختلف ہے وہ ظالم کو ظالم کہتے ہوئے جھجکتا ہے ، حالانکہ پہلے اس کا شعور غیر جانبدار نہ تھا۔ ظالم کو ظالم، اور مظلوم کو مظلوم کہنے سے وہ بالکل ہچکچاتا نہیں تھا، سیاہ حاشیے میں اس کا یہ رجحان بدل گیا ہے۔ مزدور اور سرمایہ دار کے ساتھ وہ عام انسانوں کا سا سلوک کرنے لگتا ہے، اس کتاب میں یہ بتانے کی کوشش کرتا ہے کہ فساد میں سب شریک تھے اس لئے اس کی ذمہ داری کسی پر عائد نہیں ہوتی۔ منٹو کا یہ فیصلہ سرمایہ داری کی کھلی حمایت کے برابر ہے۔

منٹو کو سب کچھ کہا جاسکتا ہے اس کی تعریف بھی کی جاسکتی ہے اور برائی بھی، لیکن اس کے عظیم افسانہ نگار ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ تاثیر اور دلچسپی افسانہ کی سب سے پہلی شرط ہے، منٹو اپنی کہانیوں کی ٹیکنک سے ان میں یکساں دلچسپی پیدا کردیتا ہے اس کے افسانوں کا اختتام اس قدر غیر متوقع ہوتا ہے کہ پڑھنے والے حیران رہ جاتے ہیں۔ منٹو کا مشاہدہ بہت وسیع تھا اسی اعتبار سے اس کے موضوعات میں بھی تنوع پایا جاتا ہے۔ وہ زندگی کو ہر زاویہ سے دیکھنے کا عادی تھا اور جس انداز سے دیکھتا تھا اسی انداز سے بیان کردیتا تھا۔ منٹو کے ماحول کی تعمیر میں عورتوں، طوائفوں اور فلم کمپنیوں کو بڑا دخل ہے، ان کے متعلق اس کے تجربات بہت گہرے ہیں، چنانچہ رنڈیوں کی زندگی اور نفسیات سے متعلق اس نے کافی کہانیاں لکھی ہیں۔ فلم انڈسٹری کے تجربات پر بھی افسانے لکھے ہیں۔ اسی کے ساتھ دوستوں اور انڈین کرسچین لڑکیوں کی خواہشات کے بارے میں بھی اس نے بہت سی کہانیاں لکھی ہیں۔ شہری زندگی پر منٹو نے اتنے افسانے لکھے ہیں کہ اس موضوع کو اس کا محبوب موضوع کہا جاسکتا ہے لیکن ایسی کہانیوں میں صحت مند اور حیات انگیز عشق نہیں ہے بلکہ جنس کی تاریکی پھیلی ہوئی ہے۔ ایک کہانی "نامکمل تحریر" اس رجحان سے مختلف ہے۔ اس میں صحت مند اور زندگی بخش رومان کی جھلک موجود ہے۔ کوئی ادیب یا افسانہ نگار جب بے مقصد واقعہ نگاری پر اتر آتا ہے تو اس کا فن زندگی سے خالی ہوجاتا ہے کیونکہ جو واقعہ زندگی پر صحت مند اثر نہیں ڈالتا، وہ ایک بے کار فعل بن کر رہ جاتا ہے جس کے بیان کرنے سے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا، بلکہ بعض اوقات انسانی فلاح پر اس کا بہت خراب اثر پڑتا ہے۔ منٹو کے یہاں اس قسم کی واقعہ نگاری کی مثال دھواں، پھاہا اور بلاؤز میں پائی جاتی ہے، جنون منٹو کا دوسرا مرغوب اور پسندیدہ موضوع ہے، اس کے انقلابی کردار بھی جدوجہد سے کترا کر جنون کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور ہوتے ہیں اور وہ انہیں پاگل خانوں میں ڈھکیل دیتا ہے یا موت کے گڑھے میں ڈال دیتا ہے۔ اس کے انقلابی کردار بھی عمل اور قربانی کے سیدھے راستہ پر نہیں چلتے۔ تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ منٹو نے اردو کو بڑے اچھے اچھے کردار بھی دیئے ہیں آخر تک وہ ان کرداروں میں اضافہ کرتا رہا۔ خوشیا، سوگندھی اور گوپی ناتھ روپ بدل بدل کر اس کی کہانیوں میں آتے تھے۔ اس کے دئے ہوئے بہت سے کردار ابدی ہیں وہ ہمیشہ سماج میں موجود رہیں گے۔ اور جب تک وہ موجود رہیں گے۔ سعادت حسن منٹو بھی زندہ رہے گا۔ (باقی صفحہ ۲۳ پر دیکھئے)

مہندر ناتھ

معصوم افسانہ نگار

منٹو اپنی زندگی میں جنسی افسانوں کی وجہ سے اتنا بدنام ہو گیا تھا کہ بیش تر نقادوں نے اس کے افسانوں کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ کچھ لیبل چپکا دیے گئے، اور منٹو کے افسانے پڑھے بغیر ان پر فتویٰ صادر کر دیا جاتا اور پھر تو یہ حالت تھی کہ منٹو کا افسانہ پڑھتے ہی نقاد اور قاری بدک اٹھتے تھے۔ اپنے ہاں ایک قاعدہ سا بن گیا ہے کہ افسانہ نگار کے افسانے مت پڑھو۔ بس ایک لیبل کو ذہن میں رکھ لو اور فوراً نتیجہ اخذ کر لو۔

اس میں شک نہیں، منٹو ایک بیباک نڈر، بدزبان اور منہ پھٹ افسانہ نگار تھا لیکن اس کے افسانوں پر فرائیڈ کا لیبل لگانا منٹو کی توہین کرنا ہے۔ حالانکہ فرائیڈیت کوئی اتنی خطرناک چیز نہیں کہ پڑھنے والے بغیر پڑھے ہی اس سے دور بھاگنے لگیں۔ منٹو فرائیڈ سے کبھی متاثر نہیں ہوا نہ ہی اس نے کبھی فرائڈ کے نتائج کو پڑھ کر افسانے لکھے اور نہ ہی منٹو نے انسان کی جنسی زندگی کے متعلق کچھ اپنا کوئی فلسفہ پیش کیا۔ منٹو نے کبھی ڈی ایچ لارنس یا جین پال سارتر یا ماردیا کی طرح فرائیڈ کو اپنانے کی کوشش نہ کی۔ گو اس سے کسی ذہین نقاد کو انکار نہیں ہو سکتا کہ فرائڈ نے اپنے تجربات کی بنا پر انسان کی جنسی زندگی کے بارے میں اہم معلومات بہم پہنچائی اور انسان کی پیچیدہ جنسی زندگی کو سمجھنے میں کافی مدد کی لیکن منٹو کے افسانے فرائڈیت کی گندگیوں سے پاک اور صاف ہیں۔ اگر منٹو کے افسانے ذہنی ربط و ضبط کو سامنے رکھ کر پڑھے جائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ منٹو کو اتنا مردود قرار دینا ہماری ایک بھاری غلطی ہوگی۔ اس کے افسانوں کو سمجھنے میں ہم کوتاہی کریں گے۔ اس کے کرداروں کے ساتھ ایک بہت بڑا ظلم کریں گے۔ منٹو کو محض ایک جنسی افسانہ نگار کہہ کر ٹال دینا تنقید کی توہین ہوگی۔ تنقید کا مطلب محض لیبل لگانا نہیں بلکہ افسانہ نگار کے افسانوں کو پڑھ کر اس کے خیالات کو اور عام فہم بنانا ہے جو باتیں اس نے کہی ہیں اور جو باتیں عام پڑھنے والا آسانی سے سمجھ نہیں سکتا اور جن باریکیوں سے عام قاری لطف اندوز نہیں ہو سکتا اور جو باتیں تہہ میں چھپی ہوئی ہیں، لپٹی ہوئی ہیں، انھیں منظر عام پر لانا ہے۔

ہمارے ہاں ایک عام رواج سا بن گیا ہے کہ جہاں کہیں جنس کا نام آیا، ہم نے ناک بھوں چڑھا لی۔ جنسی افسانہ نگار ہونا کوئی بری بات نہیں دراصل اس قسم کا لیبل لگانا ہی غلط ہے۔ آپ کسی افسانہ نگار کو محض سیاسی افسانہ نگار نہیں کہہ سکتے۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ فلاں افسانہ نگار محض اقتصادی افسانہ نگار ہے، یا جذباتی افسانہ نگار ہے، یا فلاں افسانہ نگار محض بھتوڑوں اور کسانوں کا افسانہ نگار ہے۔ افسانہ محض کسی لیبل کو ذہن میں رکھ کر نہیں لکھا جاتا بلکہ افسانے میں انسانی زندگی کا کوئی لمحہ قید کیا جاتا ہے تاکہ پڑھنے والا اس لمحے سے آگاہ ہو سکے۔

جہاں تک جنسی جذبے کا تعلق ہے، یہ جذبہ انسانی زندگی سے الگ تھلگ چیز نہیں۔ اسی جذبے کے زیر اثر قومیں تباہ ہوئی ہیں، سلطنتیں بنی ہیں اور اجڑی ہیں، شاعری پروان چڑھی ہے، نئی نئی چیزیں تخلیق ہوئی ہیں، بڑا ہی حسین جذبہ ہے یہ، بڑا ہی اہم جذبہ ہے یہ، اس کی اہمیت کو گھٹانا، انسانی زندگی کا مذاق اڑانا ہے۔ اس کی بنیادی اہمیت سے انکار کرنا انسانی زندگی سے منہ موڑنا ہے اور ساری زندگی کو مسخ کرنے کے مترادف ہے۔

ہر شخص اس بات سے آگاہ ہے کہ پیٹ بھرنے کے لئے اس سرمایہ داری نظام میں انسانوں کو کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ اسی طرح ایک خوشگوار جنسی زندگی گزارنے کے لیے ہر شخص کو مختلف منازل سے گزرنا پڑتا ہے۔ پیٹ اور جنس کے مسئلے بڑے اہم مسئلے ہیں۔ ان دونوں کے گرد انسانی زندگی طواف کرتی ہے، کبھی زندگی بنتی ہے، کبھی بگڑتی ہے۔ یہ درست ہے کہ منٹو نے جنسی جذبے کو زیادہ اہمیت دی۔ لیکن یہ تو اس کے دیکھنے اور پرکھنے کا انداز تھا۔ منٹو کی آنکھوں پر ایک جنسی عینک لگی ہوئی تھی، جس سے وہ مسخ شدہ کرداروں کو دیکھتا تھا، وہ کردار جو جنسی ناآسودگی کی وجہ سے جانور اور حیوان بن گئے تھے۔

اگر ہم اپنی جنسی زندگی پر نگاہ ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ہم نے اس جذبے کے تحت کیا کچھ نہ کیا۔ ہم نے راتیں جاگ جاگ کر کاٹیں۔ کتنی بار ہمارا دل دھڑکا۔ کتنی بار محبوبہ کو نہ پانے کی وجہ سے ہم نے خودکشی کرنے کی کوشش کی۔ شادی کرنے کے لئے ہم نے کیا کچھ نہ کیا۔ کسی خوب صورت لڑکی کو دیکھ کر ہمارے دل کے ویرانے میں کن کن پھولوں اور خوشبوؤں نے جنم لیا۔ بیوی یا معشوقہ پا کر ہم نے کیسی کیسی حرکتیں کیں۔ جس کا ہلکا سا خاکہ ہم منٹو کے افسانوں میں دیکھ سکتے ہیں، پوری تصویر نہیں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ منٹو کو یوں نہیں لکھنا چاہیے تھا۔ جب وہ عورت کا ذکر کرتا ہے تو وہ پرانی قدروں کو کیوں تہس نہس کرتا ہے وہ کیوں عورتوں کے کولھے اور چھاتیاں اور ان کے جسم کے دوسرے حصوں کو اتنی بے دردی سے گنواتا ہے، کیا اسے گھن نہیں آتی؟ کیا اسے انسانی زندگی کی عظمت کا احساس نہیں؟ کیا اسے ماں کی ممتا اور بہن کے پیار کے جذبے کا پتہ نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ منٹو کو ان تمام باتوں کا نہ صرف احساس ہے، بلکہ شدید احساس ہے۔ لیکن کیا کیا جائے کہ بیسویں صدی میں عورت کی بانہیں، اس کے کولھے، اس کی عصمت، اس کا سینہ بازار کی زینت بن گیا ہے۔ عورت سر بازار نیلام ہوتی ہے تو منٹو جھنجھلا کر ان تمام باتوں کو اپنے افسانوں میں سموتا ہے۔

یہ درست ہے کہ منٹو بات کہتے ہوئے شرماتا نہیں۔ اس لئے اب اس قسم کی شرم کی گنجائش نہیں رہی وہ روایتی شرم کی تمام سرحدوں کو توڑ کر انسانی زندگی کے اصلی روپ کو ہمارے سامنے رکھتا ہے اور کہتا ہے "تم اپنی اصلی عورت دیکھ لو۔" اور اس اصلی صورت کو دکھانے کے لیے منٹو کو ایک نیا انداز بیان اختیار کرنا پڑا۔ کیونکہ جب زندگی کی قدریں بدلتی ہیں جب انسانوں کی بول چال، ان کے تن ڈھانپنے اور ساتھ رہنے سہنے کے انداز بدلتے ہیں۔ جب پرانی اخلاقی قدریں نئے سانچوں میں ڈھلتی ہیں۔ جب جھگڑا سے بڑھ کر ہم دیہاتی سے [illegible]

کر بگل سے قلموں کی طرف رُخ کرتے ہیں۔ جب تلوار کی تیز دھار کند ہو جاتی ہے تو ایٹم بم کا زمانہ آتا ہے تو صاف ظاہر ہے کہ لوگوں کے بات کرنے کا طریقہ بدلے گا۔ جب مرد اور عورت اپنے حقوق کے لئے آمنے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جب ضبط تولید کے لئے دواخانے کھل جاتے ہیں۔ جب عورت ہوائی جہاز چلانے لگتی ہے، جج بنتی ہے، منصف بنتی ہے، ایکٹرس بنتی ہے، پارلیمنٹ کی ممبر بنتی ہے، کیبنٹ کی ممبر بنتی ہے۔ مردوں کو اپنے فیصلے سے جیل میں ٹھونس سکتی ہے، فوج میں بھرتی ہو کر دشمن کا مقابلہ کرتی ہے تو سمجھ لیجئے کہ پرانے سماجی نظام کا ڈھانچہ ڈھ رہا ہے۔ پرانی اخلاقی قدریں اپنی جاذبیت اور افادیت کھو چکیں اب زندگی کی نئی قدریں جنم لے رہی ہیں تو ان سب باتوں کا اثر ادب پر پڑتا ہے۔ یہ درست ہے کہ زبان اتنی جلدی نہیں بدلا کرتی لیکن لکھنے کا انداز بدل جاتا ہے۔ جو زبان چاسر کی تھی وہ زبان شیکسپیئر نے استعمال نہیں کی۔ اور جو زبان شیکسپیئر نے استعمال کی وہ برنارڈ شا نے نہیں برتی۔ اسی طرح جو زبان اور جس لہجے میں رتن ناتھ سرشار نے "فسانۂ آزاد" لکھا۔ یا جو زبان شرر نے اپنے ناولوں میں استعمال کی اور جس طریقے اور جس اسٹائل سے طلسم ہوش رُبا لکھی گئی اس طرح سے آج کا مصنف نہیں لکھتا اور نہ ہی لکھے گا۔

اور منٹو اس بدلتی ہوئی حقیقت کا بہت بڑا علمبردار تھا۔ ہمیں اس کے اسٹائل سے چڑ ہے۔ جو لفظ وہ استعمال کرتا ہے یا جس طرح سے وہ زندگی کے گھناؤنے پہلوؤں کی عکاسی کرتا ہے یا جس طرح وہ جنسی مسائل پیش کرتا ہے یا جو زبان وہ استعمال کرتا ہے اس سے ہم بہت چڑتے ہیں۔ منٹو اسی انداز بیان کی وجہ سے منظر عام پر آیا۔ اُس کی بے باکی اس کا ہتھیار تھی اُس کا منہ پھٹ ہونا، اس کا نڈر ہونا وقت کی پکار تھا وہ لاگ لپیٹ کا قائل نہیں تھا۔ وہ ایک چہرہ رکھنے کا عادی تھا۔ ہم ادبی اور سیاسی تحریکوں میں دو چہرے رکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ جو چہرہ ہم باہر پیش کرتے ہیں۔ وہ نہایت ہی حسین، سنجیدہ اور افضل تر ہوتا ہے لیکن دوسرا چہرہ جو کافی گھناؤنا اور ڈراؤنا ہوتا ہے، اسے ہم چھپا کر رکھتے ہیں۔ لیکن منٹو اس انداز بیان کا قائل نہیں تھا۔ منٹو اسی قسم کا گھناؤنا چہرہ رکھنے کا عادی تھا۔ وہ اسی چہرے کو ہمیشہ منظر عام پر لاتا، اور اسی وجہ سے منٹو نے اپنی زندگی میں بہت گالیاں کھائیں۔ ہم نے اسے بدنام کیا، اس پر غلط لیبل لگائے، اُسے جنس کا پرستار کہا، اسے نفسانیت کا شیدائی کہا، اُسے جنس کا مریض کہا۔ درحالانکہ منٹو جنسی مریض نہ تھا، بلکہ جنسی مریض ہم اور آپ ہیں، جو اس کی باتیں پڑھ کر بدک اٹھتے ہیں اور اُسے گالی دینے پر اُتر آتے ہیں۔ لیکن بڑا ڈھیٹ تھا منٹو۔ اس میں شک نہیں کہ اسے اپنے قلم اور ذات پر پورا اعتماد تھا۔ منٹو جانتا تھا کہ وہ جو کچھ محسوس کرتا ہے وہ وہی لکھے گا ------ چاہے، سارا ہندوستان اور پاکستان اس کے خلاف ہو جائے۔ چاہے وہ جیل میں ٹھونس دیا جائے۔ آپ نے اس پر مقدمہ چلا کر دیکھ لیا، وہ اپنی بات کہنے سے باز نہ آیا۔ اور منٹو بات کہتے کہتے سولی پر چڑھ گیا۔ ہماری اور آپ کی آنکھوں کے سامنے۔ اس قسم کی سچائی کے پرستار بہت کم ملیں گے۔ کتنے آدمیوں میں آج ہمت ہے کہ وہ زمانے کو دشمن بنا کر اپنی بات کہہ سکیں۔ اس قسم کا رویہ بہت کم ادیب آج تک اختیار کر سکے ہیں۔ سچائی سے اتنی لگن اور اپنے فن سے اتنی محبت شاید ہی کسی اور ادیب کو تھی۔

جہاں تک منٹو کے جنسی افسانوں کا تعلق ہے، اس سے ایک بات ظاہر ہوتی ہے کہ منٹو نے اس بات پر زیادہ زور دیا کہ پہلے جنسی مسائل کا حل سوچ لیا جائے۔ پہلے جنسی گتھیوں اور جنسی ناہمواریوں کو ہموار کر لیا جائے، تو زندگی بہتر ہو جائے گی، اور اقتصادی مسئلے کو جنسی مسئلہ سے الگ رکھنے کی کوشش کی۔ انسانی جبلت پر زیادہ زور دیا۔ درحالانکہ جنسی مسئلہ اقتصادی ڈھانچے سے الگ نہیں دیکھا جاتا۔ ان دونوں کا آپس میں میل ہے۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ اقتصادی اور سیاسی ڈھانچہ صحت مند ہو جائے اور اخلاقی اور جنسی مسائل نہ سلجھیں۔ کیونکہ اخلاقی قدروں کی جڑیں بڑی مضبوط اور توانا ہوتی ہیں اور ہزاروں سال سے خون میں رچی ہوئی ہوتی ہیں، اخلاقی ڈھانچے پر مذہب اور توہمات کی گہری چھاپ ہوتی ہے اور ان کی وجہ سے جنسی مسائل پر پردہ ڈالا جاتا ہے۔ مذہب نے انسانی زندگی کی ترقی کی راہ میں ہمیشہ روڑے اٹکائے ہیں لیکن آج مذہب کی چھاپ اتنی مضبوط نہیں۔ پرانا مذہبی ڈھانچہ ٹوٹ رہا ہے۔ آج ہمیں سائنسی نقطۂ نگاہ کو برتنا ہے اور زندگی کی پرانی قدروں کو نئے انداز سے سوچنا ہے۔ جنسی مسائل کو کھنگالنا ہے اور نئے ڈھانچے میں نئی قدروں کو سمونا ہے، تاکہ انسان کی زندگی، روٹی اور کپڑے کے مسئلے کو حل کر کے اور آگے بڑھ سکے اور اس کی کرۂ ارض کی زندگی زیادہ شاداب اور حسین بن سکے۔

اگر ہم منٹو کے افسانے پڑھنے کے بعد اس کا موازنہ مغربی ادیبوں سے کریں، تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ منٹو اس سلسلے میں بڑا ہی معصوم افسانہ نگار تھا۔ آپ زولا کو پڑھ ڈالئے jules romain کو پڑھئے۔ ڈی ایچ لارنس کو پڑھئے، ماردیا کو پڑھئے، ہمنگ وے کو پڑھئے، موپاساں کو پڑھئے۔ اسٹن بیک کو پڑھئے۔ ہندستان کے مشہور ڈراماسٹ کالیداس کو پڑھئے جنہوں نے ان ہی مسائل سے اپنے ادب کو شاداب کیا ہے۔ جنہوں نے جنسی زندگی پر بے باک تنقید کی ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ منٹو ان کے مقابلے میں کمسن تھا۔

یہ درست ہے کہ جب منٹو عورت کے جسم کی ساخت کا ذکر کرتا ہے تو ہم اس کے چند بیباک جملے پڑھ کر شپٹا جاتے ہیں۔ جیسے ہم نے آج تک کسی کا سینہ نہیں دیکھا۔ جیسے آج تک ہمارے ذہن میں کسی عورت سے کولہے نہیں آئے۔ جیسے آج تک ہم کسی رنڈی کے گھر نہیں گئے۔ جیسے ہم آج تک محض رام نام اور اللہ کا جاپ کرتے رہے ہیں۔ جیسے عورت سے ہمیں کوئی پیار نہیں اور ماسوا اپنی بیوی کے کسی غیر عورت کی طرف ہم نے کبھی للچائی ہوئی نگاہوں سے نہیں دیکھا۔ یا ہم نے کبھی کسی وقت کسی حسین عورت کو پانے کی تمنا نہیں کی۔ یا ایک کمرے میں رہ کر، جہاں ایک ہی جگہ دو دو خاندان رہتے ہیں اور ان ہی جگہوں پر عورتیں بچے جنتی ہیں اور یہ بچے ان ہی جگہوں میں رہ کر جوان ہوتے ہیں۔ اور شاید ہم نے اور آپ نے کبھی نہ سوچا کہ رات کو میاں اور بیوی کیسے سوتے ہیں۔ بچے کہاں سے آتے ہیں۔ وہ کیا سوچتے ہوں گے۔ ان بچوں پر اس زندگی کا کیا اثر پڑتا ہوگا۔

ہو سکتا ہے کہ ہم یوں سوچنا شروع کر دیں۔ پہلے روٹی اور کپڑے کا مسئلہ حل کر لیں، پہلے کمرہ بدل لیں، تنخواہ بڑھ جائے سو روپے کے تین سو روپے ہو جائیں، ایک کمرے کے بجائے تین کمرے ہو جائیں، پھر تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس خواب کی تکمیل تک آپ بوڑھے ہو جائیں۔ آپ کے سر کے بال سفید ہو جائیں اور آپ کی معشوقہ آپ کو چھوڑ کر کسی دوسرے مرد کے پاس چلی جائے۔ ایسی باتیں ہو سکتی ہیں، بلکہ روزمرہ ہوتی ہیں۔ ہر شخص کی زندگی پر ملک کے اقتصادی ڈھانچے کا اثر پڑتا ہے اس دور ابتلا میں ہر پڑھا لکھا آدمی سوشلزم کے موٹے اصولوں سے واقف ہے۔ منٹو نے بھی کمیونزم کے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور پڑھا ہوگا۔ منٹو کو اس بات کا ضرور علم ہوگا کہ انسانی زندگی کی فلاح اور بہبودی کس طرح ہو سکتی ہے۔

لیکن افسانہ یا نظم لکھنے کے لئے محض کسی کے متعلق کچھ لکھ دینا کافی نہیں ہوتا، وہ کون سی شئے ہے وہ کون سا جذبہ ہے جو ادیب کے ذہن کو حرکت میں لاتا ہے کہ وہ افسانہ لکھنے پر مجبور ہو جائے، اس کا ابھی تک تجزیہ نہیں کیا گیا۔ اکثر ہم تنقید کرتے ہوئے ان باتوں کو نظر انداز کر جاتے ہیں اور محض افسانوں سے کسی افسانہ نگار کی ذہنی کیفیت کا اندازہ کر لیتے ہیں۔ انسانی ذہن ایک بہت بڑی لیبارٹری ہے جہاں کئی کردار آ کر ذہن کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں اور کون کہہ سکتا ہے کہ کس وقت کس کردار کے لئے ذہن کا دروازہ کھل جائے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک ادیب منفی کرداروں سے زیادہ دلچسپی کا اظہار کرے اور دوسرا افسانہ نگار مثبت کرداروں کو پیش کرے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک افسانہ نگار کا جھکاؤ اقتصادی مسئلوں کی طرف زیادہ ہو اور دوسرے کا سیاسی مسئلوں کی طرف اور تیسرے کا جنسی مسئلوں کی طرف اور چوتھا سیاسی، اقتصادی اور جنسی میلانات کو ملا کر افسانوں کی تخلیق کرتا رہے۔ لیکن جس ادیب نے اپنے افسانوں میں، سیاسی رجحانات کا ذکر نہیں کیا اس

کے متعلق یہ فتویٰ صادر کرنا غلطی ہوگی کہ اس ادیب کو سیاست کے متعلق کچھ بھی علم نہیں۔ ہم اپنے آپ کو اتنا عقلمند سمجھ لیں کہ ہمیں ہر دوسرا شخص بیوقوف نظر آئے۔ ایک ادیب کس طرح بات کرتا ہے کون سے کرداروں کا انتخاب کرتا ہے۔ یہ عمل اس کی افتادِ طبع پر منحصر ہے۔ اس کا انحصار اس کی اپنی تربیت اور اس کے اپنے رجحان پر ہے۔ وہ کس موضوع کو لیتا ہے وہ کن کرداروں کو چنتا ہے۔ اس کا تعلق اس کی اپنی زندگی کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کا بچپن کیسے گزرا۔ جوانی سے لے کر بڑھاپے تک اس نے کیا کچھ کیا۔ اس پر کیا بیتی۔ اور ساتھ ہی وہ جس زندگی اور جن کرداروں اور جس ماحول سے اچھی طرح واقف ہے یا جس طریقے سے وہ اپنے آپ کو بہتر express کرسکتا ہے وہ اسی طرح لکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ محض افسانوں کو پڑھ کر کسی ادیب کی سیاسی بصیرت یا اس کے فلسفۂ حیات کی جانچ کرنا سخت غلطی ہوگی، کیونکہ ہم افسانوں کو پڑھ کر کسی ادیب کے سیاسی رجحان کا پتہ نہیں لگاتے بلکہ اس کی زندگی اور اس کے جذبات اور احساسات سے ہم آغوش ہوتے ہیں، جن کی تخلیق اس ادیب نے کی ہے۔ اس لئے منٹو پر تنقید کرتے ہوئے ہمیں اس بات کا خیال رکھنا پڑے گا۔

میں یہاں یہ بات واضح کردوں کہ کسی ترقی پسند فلسفۂ حیات سے اپنے آپ کو وابستہ کرنا کوئی بڑی بات نہیں۔ منٹو کسی فلسفے کا قائل نہ تھا اور اس میں منٹو کی کوئی برائی نہیں۔ لیکن منٹو نے کسی ترقی پسند تحریک کو نہ اپناتے ہوئے بھی کبھی رجعت پسندی کا ساتھ نہیں دیا۔ مثلاً اس نے اپنے افسانوں میں کبھی یہ نہیں کہا کہ غریبوں پر ظلم ہونا چاہیے یا سرمایہ داری آج کے دور میں ایک بہتر نظام ہے اور اسے قائم رکھنا چاہیے۔ یا اس نے اپنے افسانوں میں انسان کی بے عزتی کی ہو یا کبھی جنگ بازوں کا ساتھ دیا ہو یا فاشزم کا پرچار کیا ہو، یا ظلم و استبداد کو سراہا ہو یا یہ کہا ہو کہ جنگلے اور کھول دو۔ یا واجد علی شاہ کی طرح اس نے اپنے لئے کوئی حرم کھول رکھا ہو یا اس نے کبھی امریکہ کی امپریلسٹ پالیسی کی حمایت کی ہو یا فرقہ وارانہ فسادات کی حمایت کی ہو۔ یا اسلامی ادب کے حق میں نعرہ بلند کیا ہو۔ یا عریانی کو فلسفۂ حیات بنا کر پیش کیا ہو۔ منٹو ایک متوسط طبقہ کا ادیب تھا۔ میٹرک پاس ادیب۔ جس نے زندگی کا زہر چکھا تھا۔ زندگی کی جدوجہد اتنی کڑی تھی کہ اسے نراجیت کے سوا اور کچھ نظر نہ آیا۔ یہ نراجیت کیوں پیدا ہوئی؟ یہ قنوطیت کہاں سے آئی؟ یاسیت اور انانیت کے کیا وجوہات ہیں؟ ایک کردار شریف ہوتے ہوئے بدمعاش کیسے بنتا ہے؟ یا ایک کردار بدمعاش ہوتے ہوئے اچھی خصلتوں کا کیوں مالک ہے؟ یہ تمام باتیں منٹو اپنے افسانوں میں ظاہر کرتا ہے۔ لیکن منٹو خود یہ کبھی نہیں بتاتا کہ ایسے کردار اب سماج میں پیدا نہ ہوں۔ منٹو کے کردار حقیقت نگاری کا ایک مرقع ہیں۔ منٹو ظاہری ٹیپ ٹاپ کا شیدائی نہ تھا، بلکہ وہ کرداروں کی اندرونی کیفیت پر زیادہ زور دیتا تھا۔ منٹو کے کردار گوشت اور پوست کے کردار ہیں۔ ان میں زندہ رہنے کی تمنا ہے۔ وہ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ وہ کبھی کبھار ایسی باتیں کرتے ہیں کہ ہم شرما سے جاتے ہیں۔ لیکن اب تو شرم و حیا کے ترازو بھی بدل گئے۔ شرم و حیا کوئی ابدی اٹل چیز نہیں۔ اکثر منٹو کے افسانے پڑھ کر ہمارے مولوی اور پنڈت یہ فتویٰ صادر کرتے ہیں کہ یہ افسانے ہماری مائیں اور بیٹیاں پڑھ نہیں سکتیں۔ ہمارے دادا اور والد کی آنکھیں شرم سے جھک جاتی ہیں۔

یہ کوئی اہم بات نہیں کہ جس بات سے ہمارے بزرگ شرما جائیں۔ وہ بات نہیں کہنی چاہیے۔ یا وہ بات صحیح نہیں ہوسکتی ہے یا وہ بات افسانوں میں نہیں لکھی جاسکتی۔ بمبئی میں تو ہمارے سنسروں نے فلم "ہملٹ" کے ایک حصے کو کاٹ دیا تھا کیونکہ ان کے خیال میں اس حصہ کی نمائش سے پبلک کا اخلاقی معیار پست ہو جائے گا۔ جہاں تک اخلاقی معیار کا تعلق ہے وہ ہر دور میں بدلتا رہتا ہے۔ ہر ملک کا اپنا اپنا اخلاقی معیار ہوتا ہے اور یہ اخلاقی معیار ہر شہر میں ایک جیسا نہیں ہوتا۔ بمبئی میں لوگ کھلے عام عشق لڑاتے نظر آتے ہیں، یہاں لڑکیاں لڑکوں کی طرح بال کٹوا کر دندناتی پھرتی ہیں۔ لیکن کوئی آواز نہیں کستا۔ لیکن اگر یہی حرکت آپ کسی چھوٹے سے شہر یا کسی گاؤں میں کر بیٹھیں تو آپ کا جینا محال ہو جائے۔ اسی طرح منٹو کے کرداروں سے دوستی پیدا کرنے کے لئے آپ کو ذرا وسیع القلب ہونا پڑے گا۔ جب آپ منٹو کی دنیا میں داخل ہوتے ہیں تو آپ کو ذہنی جھٹکے لگتے ہیں آپ سوچنا شروع کرتے ہیں۔ یہ جنگ والی ہیروئن کہاں سے آگئی۔ یہ "کھول دو" والی لڑکی کہاں سے ٹپک پڑی۔ یہ "تو" یہ "ٹھنڈا گوشت" یہ سب بڑا گند ہے۔ یہ منٹو کے اپنے دماغ کی اختراع ہے اس کے اپنے دماغ کی گندگی ہے۔ منٹو غلط طریقہ سے سوچتا ہے۔ اس کا دماغ الٹا ہے مفلوج ہے وہ بیمار ذہنیت کا مالک ہے۔

اگر آپ غور فرمائیں گے تو معلوم ہوگا کہ بیمار آپ بھی ہیں۔ منٹو آپ کی طرح نہیں سوچتا اور ساتھ ہی وہ یہ کبھی نہیں کہتا کہ آپ میری طرح سوچئے۔ اب آپ کیوں چاہتے ہیں کہ منٹو آپ ہی کی طرح سوچے۔ آپ ایک سیاسی ڈھانچہ بدلنا چاہتے ہیں ضرور بدلئے۔ آپ ایک نیا اقتصادی نظام لانا چاہتے ہیں، ضرور لایئے۔ کیا آپ اخلاقی ڈھانچہ بدلنا نہیں چاہتے۔ آپ یہ کہتے ہیں کہ سیاسی ڈھانچہ بدلنے کے بعد اخلاقی ڈھانچہ خود بخود بدل جائے گا۔ یہ چھو منتر کی گولی نہیں۔ اخلاقیات کا بدلنا اتنا آسان نہیں، کارخانوں کو اپنی گرفت میں لانا آسان ہے لیکن قوم کے سارے دماغوں کو اپنی گرفت میں لانا بہت مشکل ہے اس لئے اس عمل کو چلنے دیجئے۔ منٹو اگر ہمارے پرانے اخلاقی ڈھانچے پر وار کرتا ہے تو کرنے دیجئے اگر آپ کو جھٹکے محسوس ہوتے ہیں تو انہیں electric shocks سمجھئے۔ ان shocks سے بہت سے دماغ درست ہو جائیں گے۔ یہ تعفن، یہ بو، یہ بدبو جو ہماری روح میں ہے جو ہمارے جسم میں ہے جو ہماری چلت پھرت میں ہے کہ ہم نے عورت دیکھی اور ریشہ خطمی ہوئے۔ کسی کا سینہ دیکھا کہ دل دھڑکا، برہنہ پنڈلیوں پر نگاہ گئی کہ پاؤں پھسلے۔ نگاہ سے نگاہ ملی کہ صحرا اور جنگلوں میں مجنوں کی طرح گھومنا شروع کر دیا۔ یہ بھی تو ایک مہلک بیماری ہے جو اس برِ اعظم کے کونے کونے میں پھیلی ہوئی ہے اور جس کی وجہ سے ایک پوری قوم دبی دبی، سہمی سہمی سی ذہنی گھٹن سے پژمردہ اور اداس نظر آتی ہے۔

اس لئے منٹو اپنے مخصوص کردار پیش کرتا ہے۔ وہ کردار جنہیں وہ پوری طرح جانتا ہے۔ وہ کردار جو آج سے پہلے اردو ادب میں اس طرح جلوہ افروز نہیں ہوئے۔ یہ طوائفیں، یہ کوچوان، یہ بھڑوے، یہ کلرک، یہ ایکٹر، یہ ایکٹریس، یہ مولوی، پنڈت، یہ تسبیح والا ملا، یہ پاکباز انسان، جو دیکھنے میں عجیب و غریب دکھائی دیتے ہیں لیکن ہماری ہی طرح کے انسان ہیں۔ یہ طوائفیں جو جسم بیچ دیتی ہیں، لیکن ممتا کو ابھی تک بیچ نہیں پائیں۔ منٹو کو puretanical attitude سے سخت نفرت تھی۔ کیونکہ اس attitude کو رکھتے ہوئے آپ اپنی زندگی کو اپنے ذہن میں دبا دیتے ہیں اور آپ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ اس دنیا کا ہر شخص اچھا ہے، دنیا میں کوئی بیماری نہیں، سب کردار اچھے ہیں، صحت مند ہیں، دنیا میں کوئی کمینہ نہیں، کوئی رذیل نہیں۔ کیوں کہ آپ نے اپنے آپ کو ایک بہتر انسان تصور کرلیا ہے؟ اپنی سمجھ کے مطابق، اور آپ اپنے متعلق بہت جلدی فیصلہ کرلیتے ہیں کہ آپ بہتر انسان بن گئے ہیں۔ حالانکہ سمجھنے اور بننے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اور پھر آپ اسی طرح اپنے کرداروں کو ایک بہتر شکل دیتے ہیں جو بنتے نہیں۔ کاغذ پر تو بن جائیں گے لیکن زندگی سے ان کا کوئی رشتہ نہ ہوگا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ دنیا میں بہتر کرداروں کی تخلیق نہیں کرنا چاہیے۔ یا دنیا میں heroic men نہیں ہوتے یا اس دنیا میں صرف مسخ شدہ کردار ہی ہوتے ہیں۔ تقریباً ہر ملک میں، ہر دور میں heroic men پیدا ہوتے رہے ہیں۔ جنہوں نے ملک اور قوم کی عظمت کو بلندیوں تک پہنچایا۔ اور ان کی ادب میں کمی نہیں ان کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں۔ میں یہاں مثبت کرداروں کے وجود سے انکار نہیں کرتا۔ منٹو نے شاید ہی کسی مثبت کردار کو پینٹ کیا ہو۔ ہوسکتا ہے کہ منٹو آرٹسٹک طریقے سے مثبت کردار پیش نہ کرسکتا ہو۔ اسے اس قسم کے کرداروں کو پینٹ کرنے پر عبور حاصل نہ ہو، صرف اسی ایک وجہ سے ہم اُسے کیوں ملعون قرار دیں۔ یہ بحث پھر اسی بات پر آجاتی ہے کہ ادب میں مثبت کردار پیش کرنے چاہئیں یا منفی۔

دراصل خالصتاً نہ کوئی مثبت کردار ہوتا ہے اور نہ منفی۔ ان دونوں کے ڈانڈے ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ ایک کردار مثبت ہوتے ہوئے بھی تھوڑا بہت منفی ہوسکتا ہے اور دوسرا کردار منفی ہوتے

ہوتے بھی تھوڑا بہت مثبت ہو سکتا ہے کیونکہ انسان کسی فارمولے کے تحت تیار نہیں کیا جاتا۔ اس کی شخصیت بنتی بگڑتی رہتی ہے اس کا کردار گرتا اور اُبھرتا رہتا ہے۔ منٹو کے زیادہ تر کردار منفی ہیں۔ لیکن منٹو کے کرداروں نے منفی ہوتے ہوئے بھی زندگی کی مثبت قدروں کو عام کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اور منٹو نے اپنے افسانوں میں 'منفی ازم' کو ایک فلسفۂ حیات بنا کر بھی پیش نہیں کیا۔ یہاں مجھے اُبرن برگ کی بات یاد آتی ہے کہ جو بات ایک ادیب نہیں کہہ پاتا، وہ بات شاید دوسرا ادیب کہہ دے۔ کیونکہ ہر ادیب ایک ہی بات نہیں کہتا۔ ہر ادیب کے اپنے تاثرات اور تجربات ہوتے ہیں اور یہ تجربات کس طرح ادب کی صورت اختیار کر کے سامنے آتے ہیں، اس عمل کے متعلق بہت کم تحقیق ہوئی ہے۔ وہ کون سی محرکات ہیں جو ایک ادیب کو لکھنے پر مجبور کرتی ہیں، وہ کون سی تحریکیں ہیں جنھیں وہ اپناتا ہے یاد کرتا ہے اس میں اس کے اپنے ذہن کا تعلق ہے۔ وہ کن واقعات سے متاثر ہوتا ہے اور کیوں ہوتا ہے اور کیسے ہوتا ہے اس کے متعلق بہت کم چھان بین ہوئی ہے۔ کیا وجہ ہے کہ کرشن چندر بنگال کے قحط پر "ان داتا" ایسا لافانی افسانہ لکھتا ہے اور باقی افسانہ نگار اس موضوع پر اس قسم کا افسانہ نہیں لکھ سکتے۔ یا کرشن چندر نے جنس پر کیوں بہت کم افسانے لکھے ہیں۔ یا منٹو کرشن چندر کی طرح کیوں نہیں لکھتا۔ یا کرشن چندر منٹو کی طرح کیوں نہیں لکھتا۔ یا عباس ایک واقعہ سے ایک خاص اثر لیتا ہے اور میں اسی واقعہ سے ایک دوسرا تاثر لیتا ہوں۔ یا کئی بار ایسا ہوا ہے کہ ایک واقعہ کے متعلق، مختلف ادیبوں نے مختلف تاثرات حاصل کئے ہیں اور افسانے لکھے ہیں۔ اور سچائی کی مختلف شکلوں کا اظہار کیا ہے۔ اور اسی طرح پوری زندگی کا خاکہ ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ فسادات پر کرشن چندر نے "ہم وحشی ہیں" ایسی کتاب لکھی، منٹو نے "سیاہ حاشیے" لکھی۔ موضوع ایک ہی ہے لیکن سچائی تک پہونچنے کے راستے الگ الگ ہیں۔ اس میں ideology کے علاوہ ہر ادیب کی اپنی سوچ کا بھی دخل ہے۔ 'سیاہ حاشیے' میں ایک دوسرا رنگ جھلکتا ہے، ہو سکتا ہے کہ یہ تجزیہ غلط ہو لیکن 'سیاہ حاشیے' میں کہیں نہ کہیں ایک سچائی بھی پوشیدہ ہے۔ 'سیاہ حاشیے' میں جنسی رنگ غالب ہے اور یہ رنگ منٹو کا اپنا رنگ ہے۔ یہ وہ رنگ ہے، جس پر اسے پورا عبور حاصل ہے ہر ادیب مختلف راستوں سے ادب کے دائرے میں آتا ہے، اور ابھی تک ہم لوگ اس بات کا تجزیہ نہیں کر سکے کہ کیوں ہر ادیب ایک ہی طرح نہیں سوچتا اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر اس طرح ہونے لگے تو ادب بے مزا، بے جان اور پھیکا ہو کر رہ جائے۔ ایک ہی رنگ کا غلبہ ہو جائے گا۔ ادب میں یکسانیت کی چھاپ لگ جائے گی اور ادب مقید ہو کر رہ جائے گا۔ ادب میں جو طرح طرح کے رنگ ہیں، وہ ختم ہو جائیں گے۔ ادب میں کتنے ہی رنگ ہوتے ہیں۔ کہیں سرخی زیادہ ہے تو کہیں گہرا نیلا رنگ ہے۔ کہیں چاندنی کی طرح ہلکی سپیدی ہے تو کہیں گھنا اندھیرا۔ کہیں شفق پھولی ہوئی ہے تو کہیں اودی اودی گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ کہیں نیلا رنگ ہے تو کہیں پیلا پیلا، ہلکا ہلکا زرد رنگ دھوا کی طرح آنسو بہا رہا ہے تو کہیں شوخ و شنگ سے گلرنگ چھلکا ہوا ہے کہیں پسے ہوئے انسانوں کی زندگی کا نقشہ ہے تو کہیں سرد ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ کہیں ظلم و استبداد کی کہانی ہے تو کہیں کسی دوشیزہ کی مسکراہٹ آنکھوں کو خیرہ کر رہی ہے۔ کہیں کردار ریشم کی طرح نرم ہے تو کہیں تلوار کی طرح تیز۔ کہیں زلزلے کی گھڑ گھڑاہٹ ہے۔ طوفان ہے اور کہیں سمندر کی لہریں ریت سے کے نرم۔ ذروں سے ہمکنار ہو رہی ہیں۔ کہیں جنسی آگ کی گھٹن میں لوگ جل کر راکھ ہو گئے ہیں تو کہیں رومان اور محبت کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ ادب ایک رنگا رنگ بستی ہے۔ اس میں پوری زندگی کا نقشہ ہوتا ہے۔ اب تو ادب قومی سرحدوں کو توڑ کر بین الاقوامی صورت اختیار کر رہا ہے۔ ایک قوم کی خاصیتیں دوسری قوم پر اپنی پرچھائیاں ڈالتی ہیں۔ جنگ کوریا میں ہوتی ہے، بھاؤ ہندوستان میں بڑھتے ہیں۔ ایٹم بم ہیروشیما پر گرتا ہے تو کلیجہ یہاں دہلتا ہے۔ اسپین میں آزادی اور اخوت کے سپاہی گولی سے اڑائے جاتے ہیں تو نظم ہندوستان کا شاعر کہتا ہے۔ تلنگانہ میں ظلم بڑھتا ہے تو روس کا شاعر اس ظلم کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔ کوریا میں امریکی سپاہی مارے جاتے ہیں تو کرشن چندر امریکی سپاہی کی جانب سے خط لکھتا ہے۔ پاکستان پر امریکی تسلط بڑھتا ہے تو اس کے خلاف منٹو آواز بلند کرتا ہے۔ یہ صرف ایک رنگ کی بستی نہیں صرف کدالوں اور ہتھوڑوں کا شہر نہیں، صرف سنگلاخ چٹانوں اور چیتوں کا آشیانہ نہیں۔ یہاں رومان اور محبت کے پھول کھلتے ہیں۔ ہجر و وصال کی باتیں ہوتی ہیں۔ چاندنی چٹکتی ہے دھوپ کھلتی ہے۔ رنگ نکھرتے ہیں، زندگی ملتی ہے۔ موت خوب صورت چہروں کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہے۔ اس بستی میں جل پریاں بھی ہیں اور جن بھی، دیوتا بھی ہیں اور شیطان بھی۔ بڑی بڑی شخصیتیں بھی ہیں اور عام انسان بھی۔ کہیں دیسی ٹھرا ہے اور کہیں انگریزی شراب۔ کہیں بھگت سنگھ پھانسی پر لٹکا دیا جاتا ہے، تو کہیں گاندھی جی کو اپنی ہی قوم کے افراد موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ ہر ادیب، ہر آرٹسٹ مختلف راستوں سے ہوتا ہوا، مختلف باتیں کہتا ہوا زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کی عکاسی کرتا رہے گا اور ادب کے دائرے میں داخل ہوتا رہے گا۔

منٹو کا اپنا ایک دائرہ ہے۔ ہر ادیب کی اپنی حدیں ہوتی ہیں اس سے آگے بڑھنا اس کے لئے مشکل ہو جاتا ہے۔ ہر بڑے ادیب کا اپنا اسٹائل ہوتا ہے، اپنا رنگ ہوتا ہے، اپنا چہرہ ہوتا ہے، یہ چہرہ کسی دوسرے سے نہیں ملتا اور نہ ہی ملے گا۔ اس چہرے کو پہچاننے پر اپنا چہرہ نہ لگائیے کہ اسے پہچاننا مشکل ہو جائے یا اسے اتنا خوشنما نہ بنائیے کہ محض رام لیلا کا سوانگ بن کر رہ جائے کیونکہ یہ منٹو کا اپنا چہرہ ہے۔ اس کے اپنے خد و خال ہیں، اس کے اپنے نقش و نگار ہیں۔ کہیں یہ نقش گہرے ہیں کہیں ہلکے پھلکے کہیں یہ اندھیرے میں ڈوبے ہوئے ہیں تو کہیں یہ روشنی پانے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ کہیں یہ محبت کرتے ہیں کہیں نفرت۔ کہیں روتے پیٹتے ہیں، کہیں خنجر بھونکتے ہیں۔ گرتے ہیں، آگے بڑھتے ہیں، کہیں جنسی گھٹن میں مبتلا ہیں۔ کہیں یہ شریف ہیں کہیں بدمعاش۔ کہیں یہ فرشتہ سیرت ہیں تو کہیں شیطان، لیکن ہیں یہ انسان اسی مٹی کے بنے ہوئے، اسی خاک سے جنم لیا ہے یہ کسی اور ملک کے کردار نہیں، اپنے ہی جگر کے ٹکڑے ہیں۔ اپنے ہی خون کے قطرے ہیں، کہیں خون سپید ہے تو کہیں سرخ یہ منٹو کی دنیا ہے، جہاں منٹو کے کردار چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ منٹو نے اپنے خون کی سیاہی سے ان کرداروں میں رنگ بھرے ہیں۔ بڑی مشکل سے، بڑی کاوش سے، اپنی جان دے کر اپنے آپ کو سولی پر چڑھا کر، اپنے آپ کو برباد کر کے، اپنے بچوں کی پروا نہ کرتے ہوئے۔ بیوی کو بھوکا مار کر، کبھی شراب کی بوتل پی کر اور کبھی فاقہ کر کے، کبھی پاگل خانے میں جا کر تو کبھی کسی اسپتال میں راتیں کاٹ کر اس نے جاندار کرداروں کی تخلیق کی۔ بڑا ہی ضدی تھا منٹو۔ بڑا ہی منہ پھٹ تھا منٹو۔ لیکن بڑا ہی بہادر تھا منٹو۔ بڑا ہی سخت جان تھا منٹو۔ جس نے اس چھوٹی عمر میں ۲۷ کتابیں لکھیں اور متواتر بیس برس تک اپنے قلم کا لوہا منواتا رہا۔ سچائی کے ایک حصے پر اُسے پورا عبور حاصل تھا۔ جو کچھ وہ لکھ گیا اور کوئی نہ لکھ سکے گا۔ افسوس صرف اس بات کا ہے کہ منٹو قبل از وقت مر گیا۔ ابھی منٹو کو بہت کچھ لکھنا تھا۔ وہ زندہ رہتا تو کئی سو افسانے اور لکھتا۔ لیکن زندگی کی جد و جہد اسے قضا کے قریب کھینچ لائی اور ایک دن اس کی تڑپتی ہوئی روح جو ہر لمحہ بے چین رہتی تھی، قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ منٹو سسکتے سسکتے مر گیا۔ اس نے روپیوں کی خاطر کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلائے۔ کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ وہ خود بھی بھوکا نہ ہے اور اس کے بیوی بچے بھی پلتے رہیں۔ لیکن روز مرہ کی جد و جہد نے اس کے جسم سے خون نچوڑ لیا تھا اور آخری دنوں میں اس کا بستر سے اٹھنا محال ہو گیا تھا۔ اسی لئے جب ہم ترقی پسند یہ کہتے ہیں کہ اس نظام کو بدل دینا چاہیے تو اس نعرہ کے پیچھے ایک زندہ جاوید حقیقت چھپی ہوتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ایک منٹو مر گیا لیکن اب اور منٹو نہ مر سکیں۔ منٹو انجمن ترقی پسند مصنفین کا ممبر نہ ہوتے ہوئے بھی اس انجمن کے ساتھ تھا۔ صرف ساتھ ہی نہ تھا بلکہ وہ اس انجمن کا ایک بڑا استون بھی تھا۔ محض انجمن کے ممبر ہونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ کیونکہ ایک ادیب کا سب سے پہلا اور بڑا کام ہے لکھنا اور منٹو ممبر نہ ہوتے ہوئے اتنا کچھ لکھ گیا کہ بہت سے ادیب انجمن کا ممبر ہوتے ہوئے بھی اتنا نہ لکھ سکے۔ منٹو آج ہماری صفوں میں نہیں ہے، منٹو کا قلم آج خاموش ہے لیکن منٹو آج بھی ہم سے کہہ رہا ہے، دیکھو اس قلم کی بے عزتی نہ کرنا۔ اس کی نوک کے سامنے ساری دنیا ہیچ ہے اس کی ایک جنبش سے دنیا بدل سکتی ہے اس سے منہ نہ موڑنا۔ اگر مارکس کی ایک "کیپٹل" دنیا کا نقشہ بدل سکتی ہے تو قلم کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ اس لئے اسے ادب ترقی پسند و اور غیر ترقی پسند و! منٹو بار بار یہی کہتا ہے۔۔۔ لکھو۔۔۔ لکھو اور لکھو۔۔۔ ●

شکیل الرحمن

منٹو اور حقیقت نگاری میں زاویۂ نگاہ

فرائڈ، ینگ، اڈلر، میک ڈوگل، واٹسن، کوہلر، کوفکا، میک کرڈی اور پارسنس جیسے ماہرین نفسیات نے بورژوازی کلچر کو اپنے سینے کا لہو دیا ہے، یہ مفکرین اپنے کلچر کو پیار کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ذہنی زندگی کے ہنگاموں اور کشمکش کو سمجھنے کے لئے ان لوگوں نے کچھ اہم اصول تیار کئے، ان اصولوں کی دریافت کے لئے انھیں بڑی جدوجہد کرنی پڑی، لیکن ان کی دریافتیں ان کے اپنے کلچر کے لئے مفید ثابت نہیں ہوسکیں، اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے کلچر میں اب اتنی قوت باقی نہیں رہ گئی تھی جس سے وہ ان اصولوں سے فائدہ اٹھا سکتا، یہ ساری قدریں ڈوب سی گئیں۔ ان مفکروں سے کلچر فائدہ نہیں اٹھا سکا حالانکہ ان لوگوں نے اپنی جدوجہد میں کسی قسم کی کوئی کوتاہی نہیں کی اور ہر قدم پر خون جگر دیتے رہے، ان اصولوں سے متاثر ہونے والے ادیب بھی لازمی طور پر کامیاب نہیں ہوسکے اور مفکروں کی دریافت کی ہوئی باتوں میں بھی وہ رعنائی پیدا نہیں ہوسکی جو کلچر کی قوت کی وجہ سے پیدا ہوسکتی تھی، یہاں پر یہ بحث مناسب نہیں ہے کہ ان مفکروں کے شعور کے اندھیرے اور اجالے کیسے تھے اور روشنی اور تاریکی میں ان کے شعوری قوت کا کیا ہاتھ رہا ہے۔ صرف اتنا کہہ دینا چاہتا ہوں کہ جس کلچر کے لئے وہ سب کچھ کر رہے تھے اس کلچر کی قوت اپنی بہت ساری رگیں توڑ چکی تھی جس کی وجہ سے ان کے تصورات سے صحیح فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا تھا اور ابھی تک اس قسم کے جھٹکے محسوس ہوتے جارہے ہیں، اور ان جھٹکوں کے شکار جہاں وہ فنکار ہیں جن کا شعور مفلوج ہو چکا ہے وہاں وہ فنکار بھی ہیں جن کے پاس شعور تو ہے مگر تنقیدی شعور نہیں ہے۔

سعادت حسن منٹو کی کہانیوں پر اگر ایک سرسری نگاہ ڈالی جائے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ منٹو نے سماج کی گندگی کا مطالعہ بڑی سنجیدگی اور بڑے خلوص سے کیا ہے، یہی سنجیدگی اور یہی خلوص ان کے فن کو تازگی اور شگفتگی دیتا ہے، جب منٹو کے قدم گندگی میں ڈگمگا گئے ہیں تو وہ کیچڑ میں لت پت ہوگئے ہیں اور ان کے فن کی سنجیدگی اور ان کے فن کا خلوص گم ہوگیا ہے، ہر طرف دھواں سا پھیل گیا ہے۔ ان کی کہانیوں میں سماج کے گہرے مطالعے کا پتہ چلتا ہے، انھوں نے زندگی کے بہت سارے گوشوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے، طنز میں ایسی تلخی پیدا کی ہے جو بظاہر تلخی معلوم نہیں ہوتی، ان کے انداز بیان میں تصنع زیادہ ہے، اور یہی تصنع ان کے فن کو بری طرح مجروح بھی کردیتا ہے۔ منٹو کے تنقیدی شعور میں جس رچاؤ کی ضرورت تھی وہ رچاؤ نہیں ہے۔ وہ اپنے تنقیدی شعور سے زیادہ کام بھی نہیں لیتے اگر ان کے شعور میں رچاؤ اور ہم آہنگی ہر قدم پر ہوتی تو وہ کبھی گندگی میں لت پت نہیں ہوتے اور ان کا فن ہمیں کسی صورت کسی مقام پر بھی مایوسیاں نہیں دیتا، منٹو نفسیات کی پیچیدگیوں کو پسند کرتے تھے، اور نفسیات کی یہی پیچیدگیاں ان کی بیشتر کہانیوں کی بنیاد ہوتی تھیں، منٹو جہاں کامیاب ہوگئے ہیں وہاں حقیقت نگاری میں بلا کی جان آگئی ہے۔ جب ہم سمجھ لیں گے کہ جنس sex منٹو کی قوت اور کمزوری دونوں ہے تو پھر ہمیں منٹو کے فن کو سمجھنے میں کبھی دشواری نہیں ہوگی۔ منٹو کی یہ قوت اور یہ کمزوری ہمیں بہت کچھ دے گئی ہے۔ ہمیں اس سرمایہ سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

جن لوگوں نے منٹو کی کہانیوں کا مطالعہ کیا ہے وہ یہ جانتے ہیں کہ منٹو نے جنس کی دنیا سے پرے بھی بہت کچھ سمجھا اور سوچا ہے۔ سیاسی زندگی کی مختلف تصویریں منٹو کے یہاں مل جاتی ہیں، جن تصویروں کے خطوط اور زاویے سے ہندوستان کے عوام کی دھڑکنوں کو نمایاں کر رہے ہیں، آزادی کی جدوجہد میں جو کچھ بھی تجربے حاصل ہوئے ہیں، منٹو ان کی باتیں نہایت ہی اچھے ڈھنگ سے کرتے ہیں اور طنز کی قوت سے ان تجربوں میں عجیب تڑپ پیدا کرتے جاتے ہیں۔ ان کی ایسی کہانیوں میں وہ گہرائیاں بھی ہیں، جہاں تاریکی، گمنامی، جہالت اور غلامی ہے اور وہ چمکتی ہوئی سرحدیں بھی موجود ہیں جن کی برف پر چاندنی کی ٹھنڈک ہے، اور آزادی اور محبت کی خوشبو ہے، ایسی کہانیوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ منٹو سب دھڑکتی حقیقتوں کی تہوں کو کھولتے جاتے ہیں، اور ایک ساتھ یا تو قہقہوں کا بازار لگ جاتا ہے یا جلتے ہوئے سیکڑوں قہقہے ایک ساتھ ایک اشارے میں بجھ جاتے ہیں۔ افسانہ نگار کا احساس اس طرح شہد شامل کرتا ہے اور بہت جلد اس مٹھاس اور اس شیرینی کو تقسیم کردیتا ہے یہ جادوگری ہے اور ادب میں یہ جادوگری اس وقت شامل ہوتی ہے جب ادیب جھجک ختم کردیتا ہے، پیار کی اس کی سانسوں کے ذریعہ سارے جسم میں پھیل جاتی ہے اور وہ قدروں کی قوت کو سمجھتے ہوئے نڈر ہوجاتا ہے ایک خاص دور کے سیاسی حالات کی تصویریں منٹو کی کہانیوں میں اچھی طرح نمایاں ہیں، "نیا قانون"، "تماشا" اور اس قسم کی دوسری کہانیاں مثال کے لئے پیش کی جاسکتی ہیں۔ "سیاہ حاشیے" کی بعض مختصر ترین کہانیوں میں بھی اس کی اچھی مثالیں مل جائیں گی۔ "نیا قانون" میں منگو کوچوان کا کردار ہمارے ادب کا ایک اہم کردار ہے۔ منگو کی شخصیت میں ایک خاص ماحول کا ہندوستانی اپنے سارے جذبات اور احساسات کے ساتھ موجود ہے منگو ایک خاص طبقہ کا نمائندہ بھی ہے، جو اپنے اڈے کا بہت عقلمند آدمی ہے لیکن اس کی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر ہے، وہ اپنی ایک سواری سے اسپین میں جنگ چھڑ جانے کی افواہ سن کر گاما چودھری کے چوڑے کاندھے پر تھپکی دے کر مدبرانہ انداز میں یہ کہتا ہے "دیکھ لینا چودھری تھوڑے ہی دنوں میں اسپین کے اندر جنگ چھڑ جائے گی۔" اور جب گاما چودھری نے اس سے یہ پوچھا کہ اسپین ہے کہاں تو استاد منگو نے بڑی متانت سے اسے جواب دیا تھا "ولایت میں اور کہاں" پھر بھی استاد منگو کو انگریزوں سے نفرت تھی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھاؤنی کے گورے اسے بہت ستایا کرتے تھے، یہ انفرادی نفرت اجتماعی نفرت بن چکی تھی، جب کسی شرابی گورے سے اس کا جھگڑا ہو جاتا تھا تو وہ موٹی موٹی گالیاں دیتا تھا اور کہتا تھا "آگ لینے آئے تھے اب گھر کے مالک ہی بن گئے۔"
جب ایک روز استاد منگو نے کچہری سے اپنے تانگے پر دو سواریاں لادیں اور ان کی گفتگو سے اسے پتہ چلا کہ ہندوستان میں جدید آئین کا نفاذ ہونے والا ہے تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس روز وہ بے حد خوش تھا وہ یہ خیال کرکے مستی میں جھوم جاتا تھا، کہ گوروں۔۔۔ سفید چوہوں کی تھوتھنیاں نئے قانون کے آتے ہی بلوں میں ہمیشہ کے لئے غائب ہو جائیں گی، کبھی گھوڑے کے ہاتھ پر زور سے اپنا ہاتھ مار کر کہتا ہے "تو دیکھتا رہ کیا ہوتا ہے، یہ روس والا بادشاہ کچھ نہ کچھ ضرور کرکے رہے گا۔" استاد منگو نے روس والے بادشاہ اور پھر انڈیا ایکٹ کو بالکل ایک جگہ کر دیا اس

کے علاوہ جب وہ کبھی کسی سے سنتا کہ فلاں شہر میں اتنے بم ساز پکڑے گئے ہیں یا فلاں جگہ اتنے آدمیوں پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا ہے تو ان تمام واردات کو نئے قانون کا پیش خیمہ سمجھتا اور دل ہی دل میں خوش ہوتا تھا۔ پہلی اپریل تک استاد منگو نے جدید آئین کے خلاف اور اس کے حق میں بہت کچھ سنا مگر اس کے متعلق جو تصور وہ اپنے ذہن میں قائم کر چکا تھا، بدل نہ سکا، وہ سمجھتا تھا کہ پہلی اپریل کے نئے قانون کے آتے ہی سب معاملہ صاف ہو جائے گا۔ استاد منگو پہلی اپریل کو جب نئے قانون کی تلاش میں نکلتا ہے۔ اس کی تصویر منٹو نے بڑی خوبصورت پیش کی ہے، نہایت ہی فطری تصویر اور نہایت ہی دردناک تصویر۔ ہماری حماقتوں اور ہماری معصومیت کی جیتی جاگتی تصویر۔ پہلی اپریل کو اس کی ایک گورے سے جھڑپ ہو جاتی ہے وہ گورے کو جی بھر کے پیٹ دیتا ہے اور کہتا ہے پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں۔۔۔۔ پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں۔۔۔ اب ہمارا راج ہے بچہ" استاد منگو کو پولس گرفتار کر لیتی ہے اور وہ نیا قانون چیختا رہتا ہے۔ اسے ایک آواز ملی "نیا قانون" "نیا قانون" کیا بک رہے ہو۔ قانون وہی ہے پرانا اور اس کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔ یہ ایک نہایت ہی معصوم شعور کی کہانی ہے۔ اس کہانی میں بہت سی باتیں اس طرح شامل ہو گئی ہیں۔ جیسے یہ باتیں اس کہانی سے تعلق نہ رکھتے ہوئے بھی اس سے اپنا گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ مثلاً منٹو ایک جگہ کہتے ہیں "لیڈروں کی عظمت کا اندازہ استاد منگو ہمیشہ ان کے جلوس کے ہنگاموں اور ان کے گلے میں ڈالے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے کیا کرتا تھا، اگر کوئی لیڈر گیندے کے پھولوں سے لدا ہوا ہوتا تو استاد منگو کے نزدیک وہ بڑا آدمی تھا، اور اگر کسی لیڈر کے جلوس میں بھیڑ کے باعث دو تین فساد ہوتے ہوتے رہ جائیں تو اس کی نگاہوں میں وہ اور بھی بڑا تھا۔" اس قسم کے ٹکڑے جا بجا ان کی کہانیوں میں ملتے ہیں جو قیمتی پتھروں کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔

منٹو نے سیاسی ماحول سے بہت سی چیزیں چن لی ہیں اور انھیں اپنی کہانیوں میں پھیلا دیا ہے انھوں نے حقیقت کو اس کی اصل حالت میں اٹھا لیا ہے لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ اس اٹھائی ہوئی حقیقت کو سامنے رکھ کر اس کی تصویر کشی کے لئے بڑی محنت کرتے ہیں اور ایک نئے ڈھنگ اور نئے پوز میں تصویر لے لیتے ہیں۔ "یہ پوز" بعض وقت بڑی حیرت میں ڈال دیتا ہے وہ کسی حقیقت کی تصویر سامنے سے لیتے لیتے یک بیک اوپر چڑھ جاتے ہیں اور اوپر ہی سے ایک پوز بنا کر فوٹو اتار لیتے ہیں، منٹو کی یہ عادت کبھی نہیں چھوٹی یہی وجہ ہے کہ انھوں نے بہت سی لازوال کہانیاں بھی دی ہیں۔ مدراس کانفرنس میں اس بار پنڈت نہرو تکیہ اچھال کر پھینک رہے تھے، کہ ان کی تصویر لے لی گئی، جب پنڈت جی نے یہ تصویر دیکھی تو حیرت سے ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا، انھیں گھبراہٹ اس بات کی تھی کہ میں اس پوز میں کس طرح پکڑ لیا گیا، منٹو کا شریر کیمرہ بھی یہی حرکت کرتا ہے ہماری شرافت اور ہماری حماقت کو وہ جس پوز میں پکڑ لیتا ہے وہ معجزہ بن جاتا ہے ہم جہاں یہ دیکھ کر گھبراتے ہیں کہ یہ کیسے ممکن ہو گیا وہاں یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ کاش ہماری یہ شرافت اور یہ حماقت عریاں نہ ہوتی، شرافت تو کم مگر حماقت کے عریاں ہو جانے پر اور زیادہ شرم محسوس ہوتی ہے۔ منٹو کے یہاں جب بھی بات آگے بڑھ جاتی ہے تو نا قابل برداشت ہو جاتی ہے وہ ایسی حقیقت کی تصویر کشی بھی اسی ڈھنگ سے کرنے لگتے ہیں جس کی ایسی تصویر کشی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ نفسیاتی بیماری نہیں ہے، بلکہ شعور کی خاص فضا کی یکسانیت ہے جو منٹو کو اس کام پر مجبور کرتی تھی منٹو نے اس یکسانیت سے الگ رہنے کی بھی شعوری طور پر کوشش نہیں کی یہ دوسری بات ہے کہ اس کام میں منٹو جہاں کامیاب ہو گئے ہیں وہاں جذبات کی گہرائی اور احساس کی شدت دونوں موجود ہیں اور ان کی مدد سے کہانی کامیاب بن گئی ہے۔ "شرابی" "تماشا" "ترقی یافتہ قبرستان" "جنگ" "بانجھ" کے علاوہ دوسری درجنوں کہانیوں میں یہ معجزہ نظر آتا ہے، منٹو نے مزدوروں کی بھی اچھی کہانیاں لکھی ہیں ان کی جدوجہد اور ان کی محنت کی تصویر کشی اچھے ڈھنگ سے کی ہے۔ ان کی ایسی کہانیوں میں ہمیں انسان کا جو مجسمہ ملتا ہے اس مجسمہ سے الگ انفرادیت رکھتا ہے، اس مجسمہ کی تعمیر منٹو نہیں کرتے بلکہ ان کی وہ کہانیاں کرتی ہیں جو ہماری سماجی زندگی کی دھڑکنوں کو شامل کر کے گہرائیوں میں اترتی جاتی ہیں، منٹو کے ٹکڑوں سے ان کہانیوں کے ٹھوس ہونے کا جہاں ثبوت ملے گا، وہاں اس کا بھی پتہ چلے گا کہ سماجی شعور میں فن کی نزاکتوں اور تخیل کے حسن کو کہاں تک دخل ہے۔ "سیاہ حاشیے" میں ان کی ایک کہانی ہے۔ "جوتا"

ہجوم نے رُخ بدلا اور سر گنگا رام کے بت پر پل پڑا۔ لاٹھیاں برسائی گئیں۔ اینٹیں اور پتھر پھینکے گئے، ایک نے منہ پر تارکول مل دیا اور دوسرے نے بہت سے پرانے جوتے جمع کئے اور ان کا ہار بنا کر بت کے گلے میں ڈالنے کے لئے آگے بڑھا، مگر پولس آ گئی اور گولیاں چلنا شروع ہوئیں۔ جوتوں کا ہار پہنانے والا زخمی ہو گیا۔ چنانچہ مرہم پٹی کے لئے اسے سر گنگا رام اسپتال بھیج دیا گیا۔" (ص ۵۵)

اسی مجموعہ کی دوسری مختصر کہانی دیکھئے جس کا عنوان ہے "الہنا"

"دیکھو یار۔۔۔ تم نے بلیک مارکٹ کے دام بھی لئے اور ایسا ردی پٹرول دیا کہ ایک دکان بھی نہ جلی۔" (ص ۶۳)

"کرامات" میں کہتے ہیں:

"لوٹا ہوا مال برآمد کرنے کے لئے پولس نے چھاپے مارنے شروع کئے لوگ ڈر کے مارے لوٹا ہوا مال رات کے اندھیرے میں باہر پھینکنے لگے کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے اپنا مال بھی موقع پا کر اپنے سے علاحدہ کر دیا تھا تا کہ قانونی گرفت سے بچے رہیں۔

ایک آدمی کو بہت دقت پیش آئی۔ اس کے پاس شکر کی دو بوریاں تھیں جو اس نے پنساری کی دکان سے لوٹی تھیں، ایک تو وہ جوں توں رات کے اندھیرے میں پاس والے کنوئیں میں پھینک آیا لیکن جب دوسری اٹھا کر اس میں ڈالنے لگا تو خود بھی ساتھ چلا گیا۔"

شور سن کر لوگ اکٹھے ہو گئے، کنوئیں میں رسیاں ڈالی گئیں، دو جوان نیچے اترے اور اس آدمی کو باہر نکال لیا۔ لیکن چند گھنٹوں کے بعد وہ مر گیا۔"

دوسرے دن جب لوگوں نے استعمال کے لئے اس کنوئیں میں سے پانی نکالا تو وہ میٹھا تھا۔

"اسی رات اس آدمی کی قبر پر دیئے جل رہے تھے۔" (ص ۳۸)

"باتمیں" ایک جگہ کہتے ہیں۔

"ایک سڑک پر ایک انگریز اپنی موٹر میں جا رہا تھا، چند آدمیوں نے اس کی موٹر روک لی، انگریز بہت گھبرایا کہ نہ معلوم یہ سر پھرے لوگ اس کے ساتھ کس قسم کا وحشیانہ سلوک کریں گے مگر اس کو حیرت ہوئی جب ایک آدمی نے اس سے کہا کہ دیکھو اپنے شوفر کو پیچھے بٹھاؤ اور خود اپنی موٹر ڈرائیو کر و تم نوکر بنو اور اس کو اپنا آقا بناؤ۔"

انگریز چپکے سے اگلی سیٹ پر چلا گیا اس کا شوفر بوکھلایا ہوا پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا، بلو وپسند لوگ اتنی سی بات پر خوش ہو گئے انگریز کی جان میں جان آئی کہ بلوائیوں سے چھوٹ گئے۔"

"جنک" ایک کہانی ہے لیکن اس ایک کہانی میں کئی کہانیاں اختتام تک پہنچتے پہنچتے مل گئی ہیں۔ جس طرح ریلوے پلیٹ فارم سے ٹرین الگ ہوتے ہی منزل پر پہنچنے کے لئے مختلف لائینوں کوان کی پٹریوں کے ساتھ چینے سے لگا لیتی ہے۔"جنک" کی دو حقیقی تصویریں دیکھئے:

"نہ مادھو نے کبھی پونہ سے خرچ بھیجا تھا اور نہ سوگندھی نے اپنا دھندا بند کیا تھا۔ دونوں اچھی طرح جانتے تھے کہ کیا ہو رہا ہے مگر نہ سوگندھی نے کبھی مادھو سے یہ کہا تھا کہ یہ تو جو ہر روز آ کر ٹر ٹر کرتا ہے۔ایک پھوٹی کوڑی بھی دی ہے کبھی تونے؟ اور نہ مادھو نے کبھی سوگندھی سے پوچھا تھا" یہ مال تیرے پاس کہاں سے آتا ہے جب کہ میں تجھے کچھ دیتا ہی نہیں۔" دونوں جھوٹے تھے دونوں ایک ملمع کی ہوئی زندگی بسر کر رہے تھے، لیکن سوگندھی خوش تھی جس کو اصل سونا پہننے کو نہ ملے وہ ملمع کیے ہوئے گہنوں ہی پر راضی ہو جایا کرتا ہے۔"(ہتک)

دوسری تصویر اسی کہانی میں دیکھئے:

"ساڑھے سات روپے کا سودا تھا۔ سوگندھی اس حالت میں جب کہ اس کے سر میں شدت کا درد ہو رہا تھا اسے کبھی قبول نہ کرتی مگر اسے روپوں کی سخت ضرورت تھی، اس کی ساتھ والی کھولی میں ایک مدراسی عورت رہتی تھی جس کا خاوند موٹر کے نیچے آ کر مر گیا تھا، اس عورت کو اپنی جوان لڑکی سمیت اپنے وطن جانا تھا لیکن اس کے پاس چونکہ کرایہ ہی نہیں تھا اس لئے وہ کسمپرسی کی حالت میں پڑی تھی، سوگندھی نے کل ہی اس کو ڈھارس دی تھی اور اس سے کہا تھا" بہن تو چنتا نہ کر" میرا مرد پونہ سے آنے ہی والا ہے۔ میں اس سے کچھ روپے لے کر تیرے جانے کا بندوبست کر دوں گی، مادھو پونہ سے آنے والا تھا مگر روپوں کا بندوبست تو سوگندھی ہی کو کرنا تھا چنانچہ وہ اٹھی اور جلدی جلدی کپڑے تبدیل کرنے لگی۔ پانچ منٹوں میں اس نے دھوتی اتار کر پھولوں والی ساڑھی پہنی اور گالوں پر سرخ پاؤڈر لگا کر تیار ہو گئی۔ گھڑے کے ٹھنڈے پانی کا ایک اور ڈونگا پی کر وہ رام لال کے ساتھ ہولی۔"(ہتک)

منٹو کو انوکھی باتیں عزیز ہیں اور یہ انوکھی باتیں منٹو کے قلم سے نکل کر اور زیادہ انوکھی بن جاتی ہیں، منٹو انوکھے پن سے الگ رہنا نہیں چاہتے، یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیوں کے انوکھے پن میں گہری جذباتیت اور نفسیاتی نقطۂ نظر میں ایک خاص قسم کا جھکاؤ پیدا ہو گیا ہے جس میں دوربینی بھی ہے اور گہرائی بھی، سچائی بھی ہے اور سچائی کی شدت بھی۔ یہی جھکاؤ آگے چل کر منٹو کو حقیقت کے انتخاب اور درحقیقت کی نفسیاتی تحلیل میں مدد کرتے کرتے تھک جاتا ہے اور ان کے تنقیدی شعور میں لاپروائی اور سہل پا کر اپنی حقیقت کو منٹو کے فن کی حقیقت سے دور رکھنے کی کوشش کرتا ہے، اور اسی وجہ سے منٹو کی کمزور کہانیاں ترتیب پاتی رہی ہیں منٹو کی ہر کہانی سے ہم کچھ جمالیاتی قدریں ایک خاص ماحول میں ایک خاص فضا کی مدد سے حاصل کر لیتے ہیں یہی منٹو کی سب سے بڑی کمزوری ہے، اور یہی بات منٹو کو ایک اہم فنکار بناتی ہے، جین پال سارترے jen paul sartra کی زبان میں یہ کہا جا سکتا ہے، کہ حقیقت کو جانتے ہوئے جھوٹی باتوں کی اشاعت کرنے والا فنکار سماج کا مجرم ہے، اور اپنے فن سے اعتبار کی بنیاد مضبوط کرنے والا فن کار کا دوست ہے منٹو کے یہاں اعتبار کی بنیاد مضبوط ہوتی ہے وہ کبھی شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کی کوشش نہیں کرتے کہ حقیقت کو سمجھتے ہوئے کسی لمحہ جھوٹی باتوں FLATTERING کا پرچار کریں۔ وہ حقیقت کی سچائی ہمیشہ پیش کرتے رہے، یہ الگ بحث ہے کہ سچائی کی پیشکش میں ان کا لہجہ کیسا رہا اور انداز بیان کی کیا صورت رہی، یہ ضرور ہے کہ جب گندی باتوں کی پیشکش کی ضرورت ہوئی تو وہ توازن قائم نہیں رکھ سکے اور مزاج کی تلخی اور گہری جذباتیت کی وجہ سے عریاں نگاری کے بری طرح شکار ہو گئے۔ نفسیاتی تحلیل کے لئے نفسیاتی احتیاط کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ منٹو کی یہ کمزوری ہے کہ وہ اس نفسیاتی احتیاط اور سماجی آہنگ کو نہیں سمجھ سکے اور اپنے فن میں گندگی کے ساتھ ایک عجیب سکون اور انتہا پسندی exterimism پیدا کر لی۔

انسانی دکھوں کے ایک خاص شعبہ پر منٹو کی نگاہیں کڑی تھیں، اس رخ پر لکھنے میں وہ بدنام بھی ہوئے اور اسی رخ پر وہ بڑے ادیب بھی بنے۔ ان کا سارا زور تحلیل نفسی اور حقیقتوں کے تصادم پر تھا وہ ذہنی کشمکش کی تحلیل پر کچھ اس طرح جھک گئے تھے کہ دوسری حقیقتیں ان کی نگاہوں سے دور ہو گئی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہسٹریا۔ hysteria علاماتی سادیت symbolic sadism خیالی سادیت ideal or imaginery sadism غصہ، خوف، سنسنی، وہم، خود تلقینی auto suggestion اظہار جنسی کی تمنا، اپنے ہم جنس یا مخالف جنس کی الفت اور مخالفت، باہمی تجسس، حسد، محبت نفرت، چھٹی حس sixth sence ابنارملٹی abnormality جبری دباؤ repression اعصابی خلل psycho neurosis جنسی بے حسی sexual anaesthesia ایک وقت نفرت اور دوسرے وقت محبت کا جذبہ foileoiu doute آسودگی اور فریب خیال اور اسی قسم کے دوسرے عناصر ہی ان کے فن کی بنیاد بنے رہے، اور منٹو کو آخر وقت تک اس پر اعتبار رہا، کہ سماجی مسائل کا بہت زیادہ انحصار جنس کی جبلت پر ہے اور صرف تجزیۂ نفس کی تحریک اس جبلت کی تاریکیوں کو ختم کر سکتی ہے۔ تجزیۂ نفس سے انسانی فطرت کا مشاہدہ جس قدر ہو سکتا ہے، اسی حد تک کسی فنکار کو جانا چاہیے۔ منٹو اس حد سے آگے بھی بڑھے ہیں یہی وجہ ہے کہ "بلاؤز" "دھواں" "پھاہا" "اوپر نیچے اور درمیان" "ٹھنڈا گوشت" "کولی" اور اس قسم کی دوسری کہانیاں انھوں نے لکھیں، اس سلسلہ کی کامیاب کہانیوں میں "الو کا پٹھا" "وہ خط جو پوسٹ نہ کیے گئے" "چوہے دان" "شیشو" "پانچ گز" "تقی کا تب" "موذیل" "ہتک" "پھوجا حرامدا" "مختار" اور "شاہ دولے کا چوہا" شامل ہیں۔ حقیقت نگاری میں جس صحیح زاویہ نگاہ کی ضرورت تھی منٹو اسے پیدا کرتے کرتے رہ گئے اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ منٹو کا سماجی شعور وہ ابال پیدا نہ کر سکا تھا جس کی ضرورت تھی، پھر بھی منٹو کی کمزور اور فحش کہانیوں میں بھی کچھ باتیں ایسی مل جاتی ہیں جو اہم ہیں جن کی یکسر قدر ہی نہیں کرنی چاہیے بلکہ ان باتوں سے فائدہ بھی اٹھانا چاہیے۔ ان کی اچھی اور ستھری کہانیوں میں جو رعنائیاں اور برنائیاں ہیں وہ تو اپنی جگہ پر عیاں اور ظاہر ہیں لیکن سا تھ ساتھ ان کی فحش اور گندی کہانیوں میں بھی افسانہ کی تکنیک کا خاص خیال ہے اور تکنیک کا یہ خاص خیال ہمیں دعوت غور وفکر دیتا ہے۔ مثلاً کرداروں میں انسانی تجربوں کی شمولیت اور ان تجربوں کا خاص وزن۔

منٹو کا ہر کردار اپنی جگہ ایک ٹھوس حقیقت رکھتا ہے اور ہر کردار میں ایک خاص ماحول کے انسانی تجربے شامل ہو کر اس کی کردار کی انفرادیت میں زندگی پیدا کر دیتے ہیں اور یہ کردار کبھی کبھی ہم جاتے ہیں، منٹو کے یہ کردار ہمارے ماحول میں ہمارے ساتھ سانس لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور اپنی ٹھوس انفرادیت کے ساتھ۔ منٹو کے متعلق یہ سوچنا کہ وہ ناسمجھ حقیقت کا انتخاب نہیں کرتے ہیں غلط ہے۔ یہ منٹو پر خواہ مخواہ کا الزام ہے۔ انھوں نے نمائندہ حقیقتوں کے انتخاب میں جو بھی غلطی کی ہو لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ بعض نمائندہ حقیقتیں منٹو کی کہانی میں اس طرح آئی ہیں جیسے وہ کسی دوسرے افسانہ نگار کے پاس جانا نہیں چاہتی تھیں۔ ان حقیقتوں نے اپنے اظہار کے لئے منٹو کا انتخاب خود کیا ہے۔

دہت عرصہ ہوا "سویرا" "لاہور، میں منٹو نے "لذت سنگ" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا اور اپنے خاص انداز سے اس کی صفائی پیش کی تھی کہ گندگی اور جنسی عناصر جب وہ سنگ

دیے میں سما چکے ہیں تو ہم ان کی عکاسی کیوں نہ کریں۔ اسی مضمون میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"اعتراض کیا جاتا ہے کہ نئے لکھنے والوں نے عورت اور مرد کے جنسی تعلقات ہی کو اپنا موضوع بنالیا ہے، میں سب کی طرف سے جواب نہیں دوں گا۔ اپنے متعلق اتنا کہوں گا کہ یہ موضوع مجھے پسند ہے، کیوں ہے؟ بس ہے! سمجھ لیجئے کہ مجھ میں per version ہے اور اگر آپ عقلمند ہیں، چیزوں کے عواقب اور عواطف اچھی طرح جانچ سکتے ہیں، تو سمجھ لیں گے کہ یہ بیماری مجھے کیوں لگی ہے۔ زمانے کے جس دور سے ہم اس وقت گزر رہے ہیں، اگر آپ اس سے ناواقف ہیں تو میرے افسانے پڑھیئے اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ زمانہ ناقابل برداشت ہے، مجھ میں جو برائیاں ہیں وہ اس عہد کی برائیاں ہیں، میری تحریر میں کوئی نقص نہیں، جس نقص کو میرے نام سے منسوب کیا جاتا ہے، دراصل وہ موجودہ نظام کا نقص ہے۔" (منٹو)

ظاہر ہے کہ منٹو کی ان باتوں میں جذبات کی روز یادہ ہے۔ حقیقت نگاری کو محض معمولی فوٹو گرافی سمجھ لینا سخت غلطی ہے۔ اپنے وقت کی سچائی کو پہچان لینا نہایت ہی مشکل بات ہے، حقیقت نگاری کے لئے صحیح نقطۂ نگاہ، ستھری اور پاک نظر کی ضرورت ہے، جنسی تعلقات کو اپنا موضوع بنالینا کوئی ادبی جرم نہیں ہے اس موضوع پر مسلسل لکھنا ضروری ہے، لیکن ساتھ ساتھ صحیح نقطۂ نگاہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے، اور بغیر اس کے کسی موضوع میں تنوع، ستھرا پن، پاکیزگی اور برنائی پیدا نہیں ہوسکتی۔ "بو" "موتری" "بلاؤز" "پھاہا" "ٹھنڈا گوشت"۔ اور "گولی" کی حقیقت سے کس کو انکار ہے لیکن ہر حقیقت کو اس کی اپنی صورت میں ادبی قدروں کے قریب لانا درست نہیں ہے۔ صحیح نقطۂ نگاہ اور اچھی نظر حقیقت نگاری کے لئے ضروری ہے، منٹو کی ایک نئی کہانی "گولی" ہے، شفقت کے یہاں اس کے والد کے ایک ساتھی کی رفیقہ حیات اور دو نوجوان لڑکیاں جنوبی افریقہ سے لوٹنے کے بعد آتی ہیں، بڑی لڑکی فالج کی وجہ سے اپاہج ہوگئی ہے اور اس کا نچلا حصہ مفلوج ہے، شفقت اور اس کی بیوی دونوں کو اس لڑکی پر رحم آتا ہے، بیوی نے کہا کہ اس لڑکی سے کون شادی کرے گا کاش کوئی لڑکا مل جاتا۔ شفقت نے جواب دیا کہ وہ اس سے شادی کرنے کو تیار ہے۔ شفقت کی بیوی غصہ سے بول اٹھی کہ وہ اُسے اسی وقت گولی ماردے گی جب وہ اس لڑکی سے شادی کرے گا اور خالی بوتل خالی ڈبے" میں ایک نوجوان غیر شادی شدہ ہے جو خالی بوتلیں اور خالی ڈبے جمع کرتا ہے، جب اس کی شادی ہوجاتی ہے تو وہ ساری بوتلیں اور سارے ڈبے پھینک دیتا ہے اس لئے کہ اس کی نظر میں عورت بھی ایک خالی بوتل کی طرح ہے۔ "دھواں" میں بچوں کو جنسی تعلیم دینے کی بابت نہایت ہی طفلانہ ہے۔ "موتری" "بو" اور "بلاؤز" میں گندگی کا بیان کچھ اس طرح ہے، جیسے لذت لینے کے لئے یہ ساری باتیں کی گئی ہیں۔

"اس کا پتی" اور "نعرہ" میں منٹو کا پسندیدہ کردار خواہ مخواہ پاگل ہوجاتا ہے اس سے پاگل خانہ کے بستروں میں اضافہ تو ہوتا ہے فن اور زندگی کا کوئی قابل قدر اشارہ نہیں ملتا، "شیرو" میں انسان کی جنسی محبت اور کتے کی جنسی محبت میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا" کتے کی دعا" میں بات نئے ڈھنگ سے آئی ہے، اس ڈھنگ کی تعریف کرنی پڑتی ہے" منٹو کی جنس پرستی میں توازن نہیں ہے اور یہ توازن پیدا کرلینا منٹو کے یہاں کوئی مشکل بات بھی نہ تھی، منٹو کی جذبابیت انھیں فریب دیتی رہی ہے اگر ایسی بات نہ ہوتی تو پہلے کی کہانیوں کے مطالعہ کے بعد کچھ نہ کچھ توازن پیدا کرلیتے۔ یہی جذباتیت انھیں دوسرے راستہ پر بھی فریب دیتی رہی ہے۔ "نمرود کی خدائی"، "چغد" اور "خالی ڈبے" "خالی بوتلیں" میں یہ فریب ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔ اسی جذباتیت نے ان کے فن میں سطحیت کو شامل کیا جوان کی کہانیوں کا ایک عجیب عیب بن کر رہ گیا ہے۔ لاشعور نگاری کی مخالفت کسی صورت میں درست نہیں ہے۔ اس لئے لاشعور منفی طاقت سے متاثر نہیں ہوتا، اسے ایک خیال کی راہ سے دوسرے خیال کی راہ پر آسانی سے لایا جاسکتا ہے، یہاں نئے حوصلے اور نئے ارادے جنم لیتے ہیں۔ لاشعور نگاری میں خارجی حقیقتوں کے تعلقات کو بھی دیکھنا چاہیے صحت مند افکار اور خیالات کی ضرورت ہے، اعصابی حقیقت نگاری ادیبوں کو حقیقی زندگی سے بہت دور کردیتی ہے۔ ادیبوں کا مقصد مریضانہ رجحان بڑھانا نہیں ہے، شہوانیت کا پرچار اور جنسی جذبے کی تسکین کے لئے مجسمے کی تراش وخراش سماجی گناہ ہے، اس طرح نفسیاتی بیماری بڑھے گی۔ جسم پرستی فحاشی اور بے ہودگی بڑھے گی اور بدکرداری کی اشاعت ہوگی۔ منٹو کے یہاں حقیقت نگاری میں جس صحیح نقطۂ نظر کی ضرورت تھی، وہ پیدا نہیں ہوسکا۔ حالانکہ ان کے ماحول میں صحیح نقطۂ نظر پیدا کرنے کے سارے امکان موجود تھے۔

فسادات کے زمانہ میں منٹو نے بہت سی کہانیاں اسی خاص پس منظر میں لکھی ہیں "سیاہ حاشیے" کی مختصر کہانیاں بڑی جاندار ہیں۔ میں ڈاکٹر عبدالعلیم کے اس خیال سے متفق ہوں کہ ان کہانیوں میں صرف مادیت ہے اور نہ عسکری کے اس خیال کی اہمیت سمجھتا ہوں کہ ان کہانیوں میں ظالموں پر لعنت نہیں بھیجی گئی ہے کہیں کہیں منٹو بہک ضرور گئے اور اس خون بھری کہانی میں جنسی لذت کا سامان فراہم کیا، لیکن صرف اس "کہیں کہیں" کی وجہ سے منٹو کی ساری کہانیاں مردود قرار نہیں دی جاسکتیں۔ اور منٹو کو مجرم بنا کر عوام کے سامنے نہیں لایا جاسکتا۔ حسن عسکری اپنی کتاب "انسان اور آدمی" کے صفحہ ۲۰۰ پر لکھتے ہیں۔

"ان افسانوں میں بھی آپ انسان ہی دیکھیں گے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں انسان کو ظالم یا مظلوم کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ اور فسادات کے مخصوص حالات میں سماجی مقصد کا تو منٹو نے جھگڑا ہی نہیں پالا۔۔۔۔۔۔ منٹو کو افسانوں کے سماجی اثرات کے بارے میں نہ زیادہ غلط فہمیاں ہیں نہ انھوں نے ایسی ذمہ داری اپنے سر لی ہے جو ادب پوری کرہی نہیں سکتا۔" پتہ نہیں حسن عسکری سماجی مقصد سے کیا مراد لیتے ہیں، "سماجی اثرات کے بارے میں نہ زیادہ غلط فہمیاں ہیں۔" کی بات بھی خوب ہے، یہاں اس کی گنجائش نہیں ہے کہ ان باتوں کا تجزیہ کیا جائے۔ اس سلسلہ میں میں نے بھی بہت کچھ لکھا ہے اور دوسرے ادیبوں اور نقادوں نے بھی حقیقت ظاہر کی ہے، میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حسن عسکری نے شعوری اور غیر شعوری طور پر منٹو کا غلط جائزہ لیا ہے۔ حسن عسکری کے یہاں ۱۹۴۷ء کے فسادات صرف مسلمانوں کے لئے ایک بڑا قومی حادثہ ہیں، (فسادات اور ہمارا ادیب۔ از حسن عسکری۔ "انسان اور آدمی" ص ۱۸۱) وہ کہتے ہیں کہ منٹو نے نہ تو ظالموں پر لعنت بھیجی ہے اور نہ مظلوموں پر آنسو بہائے ہیں حالانکہ منٹو نے ان کہانیوں میں ظالموں پر جتنی لعنت ملامت کی ہے وہ ہر نقاد ہر ادیب اور ہر قاری محسوس کرسکتا ہے۔ طنز کے جو نشتر چبھوئے ہیں وہ بھی ہماری نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ عسکری صاحب نے اگر واقعی ایک مخلص ادیب ہو کر منٹو کے متعلق ایسا سوچا ہے تو ہمیں حیرت ہے۔ "سیاہ حاشیے" میں "مناسب کاروائی" "کرامات" "دعوت عمل" "کھاٹے کا سودا" "حیوانیت" "جوتا" "صفائی پسندی" اور "آنکھوں کی چربی" ایسی کہانیاں ہیں جن میں طنز کا وہ تیکھا پن موجود ہے جو منٹو کے فن کی ایک نمایاں خصوصیت سمجھی جاتی ہے۔

منٹو کی کہانیوں میں تعجب میں کھوجانے والی کیفیت اپنا خاص مقام رکھتی ہے۔ انھیں suspense بہت عزیز ہے۔ منٹو تعجب میں کھو جانے والی جو کیفیت پیش کرتے ہیں۔ ان میں غارت گری، عصمت دری اور خواہ مخواہ کی خون ریزی نہیں ہے وہ اس کیفیت کو انوکھے انداز سے پیش کرتے ہیں۔ (باقی صفحہ ۵۲ پر دیکھئے)

باقر مہدی

منٹو کے کردار

اردو کے افسانوی ادب کی تاریخ ابھی شروع ہی ہوئی تھی کہ منٹو ہم سے رخصت ہو گئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کسی بھی ادب کی تاریخ میں بیس یا تیس سال میں کوئی صنف ترقی کے تمام مراحل طے نہیں کر پاتی ہے۔ اردو افسانہ کی یہ بدنصیبی ہے کہ اس میں شاعری زیادہ اور افسانویت کم ہے، رومانوی خیالات اور جذبات کے سیلاب نے حقیقت نگاری کی تحریک کو عام ہونے سے بڑی حد تک روکے رکھا ہے۔ اس لئے صرف چند گنتی کے افسانہ نگاروں نے پریم چند کے ورثہ کو اپنایا ہے۔ ان چند افسانہ نگاروں میں منٹو ایک معنی میں سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ منٹو کی فن کاری کی عظمت اس کے افسانوں میں کرداروں کی رنگا رنگ تصویروں کی وجہ سے ہے۔ جیسا کہ میں نے ابتدائی سطروں میں لکھا ہے۔ کہ اردو افسانہ نگاری کی دنیا پر شاعری کا غلبہ رہا ہے اور کردار نگاری کو اہمیت ہی نہیں دی گئی ہے۔ ایسی صورت میں منٹو کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ اس نے افسانہ میں کردار کو اس کا جائز مقام دیا ہے۔

سب سے پہلے جو سوال سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ ہم افسانوی کردار سے کیا مراد لیتے ہیں۔ اس کا تفصیلی جواب ایک الگ مضمون کا متقاضی ہے۔ اس لئے یہاں اختصار کے پیش نظر ممتاز حسین کے اہم ترین مضمون افسانوی کردار کی تعریف کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ ان کا یہ مضمون "شاہراہ" کے سالنامے ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا تھا اس مضمون میں کیرکٹر اور فرد کے فرق، کیرکٹر کی نمائندگی اور کیرکٹر اور سماجی رشتے کے بارے میں بڑی ہی فکر خیز باتیں ملتی ہیں، مجھے ان کے خیال سے بڑی حد تک اتفاق ہے، اسی وجہ سے میں اس مضمون کے چند اقتباسات دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

"کیرکٹر انہیں افراد میں فی الواقع نہ کی اور امکانی صورت میں پایا جاتا ہے جو کہ فطرت اور سماج کے رشتوں کو اپنے معاشرے کے تمام افراد کی تکمیل شخصیت کے لئے کوشاں ہوتے ہیں، ان کا یہی عمل ان میں وہ قوت ارادی پیدا کرتا ہے، جو انشاء اللہ کی قوت ارادی سے مختلف ہوتی ہے کیونکہ انشاء اللہ صرف اپنی ہی قوت ارادی پر بھروسہ کرتا ہے اور وہ دوسروں کی قوت ارادی پر بھی چنانچہ یہ کہنا بھی صحیح ہوگا کہ جتنی ہی زیادہ کسی فرد کی خودی جماعتی خودی کے ساتھ منضبط اور جماعتی نصب العین سے باخبر ہوگی، اتنی ہی زیادہ اس کی قوت ارادی بھی مضبوط ہوگی۔"

ممتاز کا یہ کہنا کیرکٹر کو نئے معنوں میں دیکھنے کی اچھی کوشش ہے، کیرکٹر کو اس کے تاریخی رول سے الگ کر کے دیکھنا مناسب نہ ہوگا، آج کا سرمایہ دارانہ نظام انسانوں کی شخصیت کو نارمل طریقے سے بڑھنے اور پھلنے پھولنے کے مواقع نہیں دیتا ہے، اسی لئے نامکمل شخصیتیں ایک بڑے کیرکٹر کو جنم نہیں دے سکتی ہیں، اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ کیرکٹر کو پیش کرنے کے لئے مکمل انسان یا مکمل شخصیت لازمی ہے، اس لئے کہ آج کے دور میں اعلیٰ ترین انسان کی تلاش اور اس کا تصور دونوں خواب پریشاں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے جو کبھی عینیت پرستوں نے دیکھا تھا۔

"ایک ایسا شخص جسے انسانی سیاست سے مطلق واسطہ نہ ہو وہ نہ تو کیرکٹر ہے اور نہ ہی انسان، ایسا تو صرف سرمایہ داروں ہی کی لغت میں آیا ہے کہ ایک جعل ساز بھی کیرکٹر ہے اور ایک قاتل بھی۔"

اس کے بعد ممتاز نے سماج دشمن انفرادیت اور کیرکٹر کے فرق کو واضح کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ "ہر فرد باوجود اپنی انفرادیت کے کیرکٹر نہیں ہوا کرتا۔" اس بات سے یہ حقیقت معلوم ہو جاتی ہے کہ کسی فرد کی شخصیت کا خاکہ پیش کرنے سے کردار نگاری کے فرائض پورے نہیں ہو جاتے ہیں یا فرد کی زبان سے لمبی لمبی تقریریں کرا کے اس کی انفرادیت کو ابھارا بھی نہیں جا سکتا، کیونکہ ایسا کرنے سے کردار کے ابھرنے کے بجائے مصنف کی اپنی شخصیت کردار پر چھا جاتی ہے اور اس طرح افسانہ مصنف کے کردار کی جھلکیاں پیش کر کے رہ جاتا ہے، ہمارے افسانہ نگاروں نے اس فن کو بھی پورے علم و آگہی کے ساتھ نہیں برتا ہے، اسی لئے آج ہمیں اچھے افسانوں کی حسرت رہ گئی ہے، ممتاز حسین کے یہ جملے افسانہ نگاروں کے لئے نہایت ہی اہم ہیں۔

"اس کے برعکس کامیاب فنکار وہ ہوتا ہے جو منفرد شخصیتوں کے ذریعے سوچتا یا اپنے خیالات کو کھولتا ہے، ظاہر ہے ایسی صورت میں کیرکٹر نہ صرف اپنے نام کے ساتھ ہے بلکہ اپنی عنصر کیفیات کے ساتھ آئے گا۔ ایک متحرک و جاندار، منفرد شخص کی حیثیت سے جو صرف واقعات کی منطق ہی کے سہارے آگے نہیں بڑھتا ہے بلکہ کچھ اس سے ہٹ کر بھی جو صرف عقل ہی کا پتلا نہیں ہوتا ہے بلکہ جذبات و احساسات اور اپنی انفرادیت کا بھی مظاہرہ کرتا ہے۔ کیونکہ کیرکٹر امکانی ہوتا ہے نہ کہ فی الواقع، وہ کیرکٹر بنتا ہے، اپنی مسلسل جدوجہد سے اس کی جدوجہد دوسروں کی جدوجہد سے مختلف ہوتی ہے، جو لوگ کیرکٹر کو عمل کے طریق کار میں نہیں دیکھ پاتے ہیں وہ کسی اور کی شخصیت میں کسی اور کا کیرکٹر ڈال دیتے ہیں۔"

منٹو کے کرداروں پر تنقیدی نظر اسی کی روشنی میں ڈالنا چاہتا ہوں مگر اس سے پہلے ایک اہم بات اور کہنا ہے اور وہ یہ ہے کہ منفی کرداروں کے بارے میں سرمایہ دارانہ نظام کے سماج میں ایسے کرداروں کو پیش کرنا بھی جو خود اس نظام کے کشتہ ہیں کچھ کم بڑی بات نہیں ہے اور منٹو کے سارے کردار اس رجحان کی پوری ترجمانی کرتے ہیں وہ بنیادی طور سے اچھے انسان تھے لیکن اس کاروباری نظام اور مریضانہ ماحول کے شکار ہو گئے ہیں، نیا قانون کے منگو کوچوان اور خوشیا سے لے کر موذیل اور منظور تک سارے کے سارے کردار کسی نہ کسی مجبوری یا "ناکردہ گناہی" کی وجہ سے بھٹک گئے ہیں۔ سب میں کسی نہ کسی صورت میں ایک نارمل انسان بننے کے جذبات و خیالات تھے مگر سرمایہ دارانہ اخلاق کے قوانین نے ان کی بنیادی معصومیت کو چھین کر ان کے خوبصورت چہروں پر داغ ڈال دیئے ہیں اور ان کی شخصیتوں میں کجی پیدا کر دی ہے۔ ان کے ذہنوں میں الجھنیں ڈال دی ہیں ان کے مزاج سے نرمی دور کر کے بےرحمی اور شقاوت کو جگہ دیدی ہے ان کے دلوں میں خوبصورتی کے ہر جذبہ کو خرید و فروخت کے شعبے میں منتقل کر دیا ہے، منٹو نے زیادہ تر ان کے کرداروں کو پیش کیا ہے جو اس کے اپنے مشاہدہ میں آئے ہیں وہ منٹو نے کردار کی از سر نو تخلیق نہیں کی ہے وہ عام زندگی میں روز انکی چال ڈھال سے ہمیں متعجب کرتا ہے اور ان کی انفرادیت کو پیش کرنے میں اپنے افسانوی فن سے کام لیتا ہے اس لئے وہ اپنے کرداروں کا خالق نہیں ہے، پھر بھی ان کو عام زندگی سے ادب میں جگہ دینے کی وجہ سے منٹو کا نام لیا جا سکتا ہے، حقیقت نگاری تو یہی ہے، کہ زندگی کی عمومیت میں جاذبیت پیدا کر کے اسے ادب میں جگہ دی جائے اور یہی افسانوی کردار کی پہچان ہے وہ سڑکوں پر، بازاروں اور مکانوں میں نظر آتا ہے لیکن جب ادب میں داخل کیا جاتا ہے تو اس کے خد و خال اور اس کی شخصیت میں بنیادی فرق نہ ہوتے ہوئے بھی حقیقت اور افسانہ میں جو فرق ہے وہ نمایاں ہو جاتا ہے اس لئے افسانہ نگار کی کاریگری ہی وقت ...

بہتر ہوتی ہے جب وہ اپنے چاروں طرف گھومتے پھرتے انسانوں میں سے کسی کو منتخب کر کے اس کو افسانوی کردار عطا کرتا ہے۔ اس فن میں منٹو بڑی مہارت رکھتا ہے۔

"منٹو کے افسانے" "سعادت حسن منٹو کا پہلا افسانوں کا مجموعہ ہے، اس میں مختلف اور متضاد شخصیتیں رکھنے والے کرداروں سے لے کر ایک تصور پرست نعیم کا کردار ہے" نیا قانون" اس کا ایک سمتی میں پہلا افسانہ ہے جو اپنے طنز اور بغاوت کے جذبے کی وجہ سے ہمارے سماج پر تیز وار کرتا ہے، منگو کوچوان سہا سے انگریزوں سے بڑی نفرت ہے، اسے اپنی غلامی کا شدید احساس ہے یہ شاید اس لئے بھی ہے کہ گورے اس کو چھاؤنی میں پریشان کرتے تھے جب سے اس نے سنا ہے کہ پہلی اپریل کو نئے آئین کا نفاذ ہونے والا ہے وہ بہت خوش ہوا، اس نے اس قانون کے بارے میں تانگے پر بیٹھنے والی سواریوں کی گفتگو بھی سنی تھی اور طرح طرح کے منصوبے بنا رکھے تھے، جب پہلی اپریل آئی تو وہ نئی امیدیں لے کر اپنا تانگہ لئے سواریوں کی تلاش میں چھاؤنی آنکلا۔ اس نے سوچا تھا کہ آج نیا قانون کا دن ہے اسے کسی گورے کا ڈر نہ تھا اس لئے جب ایک گورا نظر آیا جس سے اس کی لڑائی ہو چکی تھی تو وہ بلا خوف طنزیہ انداز سے بات چیت کرتا ہے، وہ سمجھ رہا تھا کہ آج انتقام کا دن ہے" کیونکہ یہ نیا قانون کا دن ہے، اس لئے جب مار پیٹ شروع ہوئی تو وہ بار بار کہہ رہا تھا۔

"پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں ۔۔۔۔ وہی اکڑفوں ۔۔۔۔ اب ہمارا راج ہے، بچہ۔" اسے حوالات میں بند کر دیا گیا، اور سپاہیوں نے ڈانٹ کر کہا۔" اپنا قانون، نیا قانون کیا بک رہے ہو؟ قانون وہی پرانا ہے۔ یہ افسانہ اس دور کی نمائندگی کرتا ہے جس میں آزادی کی تحریک زور پکڑتی جا رہی تھی اور ہر سال لندن سے ہندوستانی رہنماؤں سے سمجھوتے کی غرض سے وفد آیا کرتے تھے ان کے آنے کے بعد ہر طرف طرح طرح کی چہ مگوئیاں ہوا کرتی تھیں، منگو کوچوان ایک ایسے ہندوستانی کے کردار کو پیش کرتا ہے جو نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہوئے بھی ملکی سیاست سے تھوڑا بہت واقف ہے۔

اس مجموعہ میں خوشیا ایک دلال کا کردار ہے۔ "نعرہ" کیشو لال مونگ پھلی والے کی کہانی ہے، جو بڑی تنگ دستی میں زندگی گزار رہا ہے، وہ مکان کے مالک کی گالیاں کھا کر جاگ اٹھتا ہے اور اس کے اندر سویا ہوا باغی انسان مجبوری و لاچاری میں بھی ایک نعرہ لگاتا ہے جس کو ن کر لوگ اسے "پگلا" کہتے ہیں۔ جملے ملاحظہ ہوں۔

"نعرہ" مار کر جب اس نے قدم زمین سے بڑی مشکل سے علاحدہ کئے اور واپس مڑا تو اُسے اس بات کا پورا یقین تھا کہ ہوٹل کی سنگین عمارت اڑاڑا دھم نیچے گر گئی ہے۔"

کیشو اور منگو میں بغاوت کا جذبہ مشترک ہے، دونوں اپنے موجودہ ماحول سے نالاں ہیں۔ ایک گورے کو مار کر انتقام لیتا ہے تو دوسرا نعرہ لگا کر۔ اس مجموعہ کے افسانے سے منٹو کے کرداروں کی ابتدا ہوتی ہے اس لئے اور بھی اہم ہیں، وقار عظیم نے اپنے مضمون "منٹو ایک عظیم فنکار" میں اس کتاب پر تفصیل سے تنقید کی ہے، یہ مضمون ماہ نو کے مارچ ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا ہے۔

منٹو نے اتنے بہت سے کردار پیش کئے ہیں کہ ان سب کا مختصر ذکر بھی ایک مقالہ میں نہیں کیا جا سکتا ہے۔ تجزیہ تو در کنار اس لئے میں نے چند منتخب کرداروں کا تجزیہ کرنا مناسب سمجھا ہے، جس سے منٹو کے کرداروں کی نمائندگی ہو سکتی ہے، منٹو نے غنڈوں، دلالوں، طوائفوں اور نچلے طبقے کے شہری کرداروں کو ان کے صحیح ماحول میں پیش کیا ہے اور کہیں بھی اپنی شخصیت کو ان کے جسموں میں نہیں ڈالا ہے بلکہ ان کے ذہنی کرب اور دبے ہوئے انسانی ہمدردی کے جذبے کو اتنی ہی گہرائی سے پیش کیا ہے جتنی کہ ان میں تھی، اس کے کردار ذہین ہیں، لیکن دماغ سے کم اور جذبات سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ ذہنی باتوں اور حادثوں کو اس کے کرداروں کی شخصیتوں کی تعمیر میں بڑا دخل ہے، پہلی نظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ معصوم لڑکیوں کا سودا کرنے والے دلال، یہ فاحشہ عورتیں اور محمد بھائی ایسے غنڈے تمام انسان دوستی اور قدروں سے نا آشنا ہیں، لیکن ان کی گھناؤنی شخصیتوں کے سینے میں وہی انسانی دل دھڑکتا ہے جو ایک دوسرے کے کام آتا ہے جس کی بنیاد دلی محبت اور خلوص پر ہے۔

بابو گوپی ناتھ منٹو کے ان کرداروں میں ہے جو ایک عرصے تک یاد کئے جائیں گے، گوپی ناتھ لاہور کا ایک رئیس ہے اسے رنڈی کے کوٹھے اور پیر کے مزار سے محبت ہے، وہ ان ہی دونوں مرکزوں پر رہ کر اپنی زندگی گزارنا چاہتا ہے اس کے گرد جونک کی طرح مطلبی افراد کا حلقہ ہے، غلام علی، سردار بیگم، غفار سائیں اور عبدالرحیم سینڈو اس کی دولت کو ہر طرح سے برباد کرتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گوپی ناتھ اصلی چغد ہے، لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے، وہ ایک عورت زینت سے محبت کرتا ہے، اتنی محبت کرتا ہے کہ زینت کے مستقبل کی فکر اسے ہر وقت دامنگیر رہتی ہے، اس کے پاس جو کچھ بچی کچھی دولت ہے، اس کی مدد سے وہ زینت کے لئے ایک شوہر ڈھونڈنا چاہتا ہے، مگر یہ عورت ایسی ملائم مٹی کی بنی ہوئی ہے کہ طوائف ہونے کے باوجود گھر کی عورت معلوم ہوتی ہے اور گوپی ناتھ شاید زینت کے اسی پہلو سے شاید محبت کرتا ہے جو زینت کو عیار اور مکار بننے سے دور رکھتی ہے اور جب زینت کی شادی ہو جاتی ہے اور افسانہ نگار طنز کرتا ہے تو وہاں بابو گوپی ناتھ کا کردار پوری طرح ابھر کے آجاتا ہے۔ زینت طنزیہ جملہ سن کر رونے لگتی ہے اور اتنے میں بابو گوپی ناتھ داخل ہوتا ہے اور یہ جملے کہتا ہے" منٹو صاحب میں سمجھا تھا آپ بڑے سمجھدار اور لائق آدمی ہیں۔ زینو کا مذاق اڑانے سے پہلے آپ نے کچھ سوچ لیا ہوتا۔" اس کے بعد وہ زینت کے سر پر ہاتھ رکھ کر خوش رہنے کی دعا کرتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ بابو گوپی ناتھ کوئی بڑا کردار نہیں ہے اس کا ذہنی شعور بھی بہت معمولی ہے لیکن وہ انسان کو پہچانتا ہے اور خود فریبی میں مبتلا ہونے کے باوجود اپنے گرد و پیش کے حالات سے اتنا بے خبر بھی نہیں ہے۔ میں اس افسانے کو منٹو کے کامیاب افسانوں میں سمجھتا ہوں، بابو گوپی ناتھ کی چھوٹی سی شخصیت بڑی خوبی سے کہانی کے ارتقاء کے ساتھ ابھرتی گئی ہے، جیسا کہ منٹو کے زیادہ تر کرداروں کی خامی ہے کہ وہ زندگی کا کوئی مستحکم یا بلند مقصد شعوری طور پر نہیں رکھتے ان کی بڑائی کسی حادثے یا واقعہ پر تھوڑی دیر کے لئے ظاہر ہوتی ہے۔

اس سے بہت ملتا جلتا ایک اور کردار "سہائے" ہے جو لڑکیوں کا بیوپار کرتا ہے اس کی شخصیت میں بھی وہی شرارت مضمر ہے، جو بابو گوپی ناتھ میں ہے، وہ لڑکیوں کے جسم کو بیچنے کے باوجود ان کے الگ الگ بینک میں اکاؤنٹ کھلوا چکا ہے اور تیس ہزار روپے جمع کر کے اپنے وطن بنارس جانا چاہتا ہے اور دکان کر کے باقی زندگی آرام سے گزارنا چاہتا ہے۔ آخر میں جب وہ بھنڈی بازار میں زخمی ہو کر گر پڑتا ہے اور مرنے سے پہلے وہ سلطانہ نامی طوائف کا روپیہ اور زیور حوالے کرتا ہے تو اسے کسی سے کوئی شکایت نہیں رہ جاتی ہے اور خاموشی سے مر جاتا ہے۔" سہائے منٹو کے اس دور کی کہانی ہے جب وہ بمبئی سے رخصت ہونے والے تھے اور شدید ذہنی کرب میں مبتلا تھے۔ سہائے ایک اچھے انسان کی روح کا سمبل بن کر اس افسانے میں آیا ہے، افسانے کے شروعات کے چند جملے یہ ہیں" یہ مت کہو کہ ایک لاکھ ہندو اور ایک لاکھ مسلمان ہیں، یہ کہو کہ دو لاکھ انسان مرے ہیں اور یہ اتنی بڑی ٹریجڈی نہیں، کہ دو لاکھ انسان مرے ہیں ٹریجڈی اصل میں یہ ہے کہ مارنے اور مرنے والے کسی بھی کھاتے میں نہیں گئے۔ وہ لوگ بے وقوف ہیں جو سمجھتے ہیں کہ بندوقوں سے مذہب شکار ہوتا ہے، مذہب، دین، ایمان دھرم، یقین، عقیدت۔ یہ جو کچھ بھی ہے ہمارے جسم میں نہیں روح میں ہوتا ہے، چھرے، چاقو اور گولی سے یہ کیسے فنا ہو سکتا ہے۔" اور آخر میں جب جگل سوچتا ہے کہ" کاش وہ سہائے کی روح ہوتا۔ بابو گوپی ناتھ اور سہائے کے ماحول میں بہت فرق ہے لیکن دونوں کے مزاج قریب قریب ایک سے ہیں وہ زینت کی خاطر بیشمار دولت برباد کرتا ہے اور سہائے پیشہ ور لڑکیوں کی آمدنی ان ہی کے حوالے کر دیتا ہے اور اس فرض کو انجام دیتے ہوئے فساد کی نذر ہو جاتا ہے، بنیادی طور سے دونوں ایماندار ہیں دونوں انسان دوستی کو اہمیت دیتے ہیں، لیکن دونوں یہ سمجھنے کی نہ تو کوشش کرتے ہیں اور نہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ

کیسا نظام ہے جوان کو کچھ سے کچھ بنا رہا ہے، بابو گوپی ناتھ پیروں اور رنڈیوں کے ساتھ رہ کر کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتا ہے، سہائے بنارس واپس جانا چاہتا ہے اور صرف کمیشن جمع کرتا رہتا ہے، دونوں کرداروں سے قاری کو تھوڑی بہت ہمدردی ہو جاتی ہے اور یہی کردار نگاری کا کمال ہے کہ منٹو دلال اور پیر پرست، رنڈی باز، یعنی سہائے اور گوپی ناتھ کی تمام خوبیاں اور خامیاں ظاہر کر دیتا ہے وہ ان کو آئیڈیل کیرکٹر بنا کر نہیں پیش کرتا بلکہ حقیقت میں وہ جیسے ہیں ویسے ہی ان کی شخصیتوں کے پیچ و خم کو اجاگر کرتا ہے۔

محمد بھائی ایک اور دلچسپ کردار ہے، وہ فارس روڈ کے علاقے کا مشہور دادا ہے، لوگ اس کے نام سے کانپتے ہیں طوائفیں اس کو پیر سمجھتی ہیں، وہ ہر ایک کی خبر رکھتا ہے ایک چھریرے جسم کا آدمی جس کے چہرے پر مونچھیں بڑی خوفناک ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی پوری شخصیت ان مونچھوں میں چھپی ہوئی ہے، اس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ نہ جانے کتنے قتل کر چکا ہے مگر وہ سولی لٹکتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا ہے اور اپنے محلّے کی عزت کی خاطر وہ ایک قتل کرتا ہے، بعد کو اس کو صوبہ بدر کر دیا جاتا ہے، محمد بھائی ان داداؤں کے کیرکٹر کی بڑی اچھی نمائندگی کرتا ہے جو اپنی بہادری اور آوارہ گردی کی وجہ سے ہر جگہ مشہور ہوتے ہیں وہ بدمعاش نہیں ہے بنیادی طور سے اس نے کسی کو لوٹ کھسوٹ کر روپیہ نہیں کمایا ہے وہ اپنے محلّے پر حکومت کرتا ہے اور اپنی رعایا کے لئے ہر طرح کی مدد کرنے سے دریغ نہیں کرتا اسے اپنی چھری سے اتنی ہی محبت ہے جتنی کسی کو اپنی محبوبہ سے ہوگی اس کی شخصیت میں ذہنی کجی نہیں ہے، وہ بیماریوں میں مبتلا نہیں ہے وہ اپنے ماحول کی اچھی طرح نمائندگی کرتا ہے اور اتنے گندے ماحول میں رہتے ہوئے بھی وہ دوسروں کی لڑکیوں کی عزت کے لئے جان تک دے سکتا ہے، اس کے کردار میں غنڈہ پن کے سارے عناصر ہیں، لیکن پھر بھی اس کی شخصیت جاذب نظر ہے اس سے دوستی کرنے کو جی چاہنے لگتا ہے اور یہی منٹو کا کمال ہے کہ وہ افسانوی کردار کو اس کے حقیقی روپ میں پیش کر کے ایسا انسان دوست بنا دیتا ہے کہ قاری کو نفرت کے بجائے اس سے ہمدردی ہو جاتی ہے۔

منٹو نے سکھ کرداروں کو بھی اپنے افسانوں میں نمایاں جگہ دی ہے، میں ٹھنڈا گوشت کے ایشر سیاں کا ذکر نہیں کرنا چاہتا ہوں کیونکہ منٹو کے بو۔ دھواں۔ کالی شلوار اور ٹھنڈا گوشت اپنی تمام شہرت کے باوجود اس کے نمائندہ افسانوں میں نہیں ہیں یہ بحث لاحاصل ہے کہ یہ افسانے کیوں اچھے افسانے نہیں ہیں، ان میں کردار نگاری بھی نسبتاً کمزور ہے بہت سے غیر ضروری واقعات بھی آگئے ہیں۔ البتہ ٹوبہ ٹیک سنگھ اچھا طنزیہ افسانہ ہے، بشن سنگھ ایک پاگل ہے جو ٹوبہ ٹیک سنگھ کا رہنے والا زمیندار ہے، پاگل خانے میں کئی سال رہنے کے بعد بھی وہ اپنی سرزمین کو نہ بھول سکا اور اس پر صرف ٹوبہ ٹیک سنگھ کا بھوت سوار رہتا تھا۔ اس پاگل کردار کی مدد سے منٹو نے اس دور کی سیاست پہ گہرے وار کئے جس کی وجہ سے پنجاب میں شدید فسادات ہوئے یہ تبادلہ کا خیال ہی فتنہ انگیز ہے، گائے بیلوں کی طرح انسانوں کا تبادلہ کہاں کی منطق تھی مگر یہ ایک بھیانک حقیقت بھی ہے کہ تقسیم کو قبول کرنے کے بعد کوئی اور راہ نجات نظر نہ آتی تھی وہ ہندوستان اور پاکستان کی سرحد پر پہنچ کر مر جاتا ہے، اور اس طرح پڑھنے والے پر مجموعی تاثر چھوڑ جاتا ہے کہ اپنی مٹی یا زمین سے انسان کو ہر حالت میں محبت رہتی ہے، خواہ وہ پاگل ہی کیوں نہ ہو دوسرے پاگلوں ---- کے ذریعے اس پوری گندگی سیاست کو بھی نشانہ بنایا گیا ہے، جو ہندو اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا چکی ہے، ٹوبہ ٹیک سنگھ میں منٹو کا فن پوری طرح سے اس ماحول کی ترجمانی کرتا ہے جہاں پاگلوں کو بھی ہندو اور مسلمان کے الگ الگ خانوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔

منٹو کے تمام کردار جو اپنی typicallity کی وجہ سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف نظر آتے ہیں لیکن حقیقت میں ان سب میں ایک چیز مشترک رہتی ہے وہ ہے ان کا انسان دوستی کا جذبہ۔۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ منٹو کے سب کردار بنیادی طور سے اچھے ہیں، اللہ داتا، ایشر سیاں اور دوسرے کردار انسانوں کی شکل و صورت رکھتے ہوئے بھی انسانی دل و دماغ سے محروم ہیں منٹو کے افسانہ سرکنڈوں کے پیچھے، میں ہلاکت کا کردار حیوانوں سے ملتا ہوا ہے۔ منٹو کی بعض کہانیاں صرف عجوبے پن کی وجہ سے کہانی معلوم ہوتی ہیں مگر ان میں مزیدار فقروں کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا ہے اس کی وجہ زود نویسی تھی، جب تک وہ کوئی عجیب بات کہانی میں نہ لکھتا تھا لوگ اس کی کہانی کو پسند نہ کرتے تھے، اسے رفتہ رفتہ خود اس چیز کی "لت" پڑ گئی، اس لئے ایسی متعدد کہانیاں ہیں جن کو عجیب و غریب بنانے کے لئے لکھا گیا ہے اس لئے ان میں کہانی پن بھی نہیں ہے، تقی کاتب، کتے کی دعا وغیرہ قسم کی کہانیاں معمولی درجے کی ہیں۔

یزید پر تنقید کرتے ہوئے منٹو کے نقطۂ نظر کے بارے میں ممتاز حسین نے کئی صحیح باتیں لکھی ہیں۔

"ان تمام افسانوں میں منٹو نے ایک قسم کی غیر جذباتیت اور بے تعلقی کی شان پیدا کر دی ہے، ممکن ہے اس سے بعض نگاہوں میں واقعات کی ٹریجڈی زیادہ گہری اور انسانی اقدار کی کسک زیادہ ابھر کر نظر آتی ہو لیکن مجھے تو یہی بے تعلقی اقدار کو انسانی رشتوں یا جذبات سے عاری کرنے کی کوشش افسانوں کو بحیثیت مجموعی اثر سے عاری کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔" "میں سمجھتا ہوں منٹو کا یہ توازن کو قائم کرنے کا نقطۂ نظر صحیح نہیں کہا جا سکتا ہے جیسا کہ میں نے شروع میں کیرکٹر کے بارے میں لکھا ہے: "اس کے پیش نظر ظالم اور مظلوم دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش بذات خود اچھی چیز نہیں ہے، بہر حال میں قاری کے ذہن پر یہ نقش ابھرے گا کہ مصنف نے مظلوم کے کردار سے انصاف نہیں کیا ہے اور اسی طرح خود کے اعتراض میں یہ بات چھپی ہوئی ہے کہ یہ کوئی فن کاری بھی نہیں ہے۔

منٹو کے قلم میں یقیناً جادو تھا، وہ معمولی سے معمولی واقعہ پر کہانی کی تعمیر کر سکتا تھا۔ اور گرے سے گرے ہوئے انسان کی کردار نگاری کر کے اسے دوسرا جنم دے سکتا تھا مگر اس کے پاس واضح تصور حیات نہیں تھا دوسرے وہ سومرسٹ ماہم ایسے افسانہ نگاروں سے شدید متاثر تھا۔ جو اپنی فنکاری کے باوجود نہایت مریضانہ تصور حیات رکھتے ہیں اور نہایت مذہبی ہیں منٹو کی شخصیت جو اس کے افسانوں سے ابھرتی ہے اس کو اس کے کرداروں سے الگ کر کے نہیں دیکھنی چاہیے۔ وہ بھی ذہنی طور سے مریض تھا جو شخصیت اس کے درجنوں افسانے پڑھنے کے بعد میرے ذہن میں ابھرتی ہے اس کو مختصراً میں ایک فقرہ میں ادا کر سکتا ہوں۔ "تو ہمیں" یہ ایسی مخلوق ہے، جس کی ساری دلکشی عجوبے پن میں ہے۔ "منٹو ماموں" کے عنوان سے اس کی شخصیت پر جو مضمون "نقوش" میں شائع ہوا ہے اس کو پڑھ کر مجھے حیرت نہیں ہوئی کیونکہ ایسی ہی شخصیت اس کے افسانوی سے ابھرتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ عجیب و غریب انسانوں یا انسانوں کی عادات و فطرت کی جستجو میں خود بھی اپنے افسانوں کا ایک کردار بن گیا تھا اور آسودگی اور دلی الجھنوں نے اس کی شخصیت کو بھی کسی حد تک مسخ کر دیا تھا۔ منٹو ایک شدید قسم کا انفرادیت پسند افسانہ نگار تھا۔ مجھے اس کی شخصیت سے محبت نہیں ہو سکتی لیکن ہمدردی ضرور تھی ہے میں اس سے کبھی نہیں ملا ہوں لیکن جب موت کی خبر آئی تو ایسا معلوم ہوا کہ اس کو بہت پہلے سے جانتا تھا۔ وہ سب کا یار بن کر رہ سکتا تھا اور ہر شخص سے لڑائی بھی کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا اس نے بہتر انسان کی زندگی کے خواب دیکھے تھے۔ مگر خود ہمیشہ بوہیمیں زندگی گزاری تھی اس کے افسانوی کردار اخلاقیات سے عاری نہیں ہیں۔ ان کی اپنی دنیا میں اخلاق کے دوسرے معنی ہیں۔ وہ بھی ایک دوسرے کی عزت کرتے ہیں۔ بظاہر وہ کتنے ہی گندے کیوں نہ نظر آئیں، لیکن ان کی روح بالکل صاف ہے۔ اس لئے ان کی اخلاقیات عام طور سے بالکل الگ ہی ہے اور کسی مذہبی یا فلسفیانہ تصور کی تابع نہیں نظر آتی ہے۔

میں نے اب تک منٹو کے نسوانی کردار کا سرے سے ذکر نہیں کیا ہے۔ اس لئے کہ میں ان سب کا الگ ذکر کرنا چاہتا تھا۔ منٹو کے یہاں عورت کے اتنے مختلف رنگوں کے کردار ہیں کہ عورت کی ساری پراسراری جاذبیت کا راز کھل ہی جاتا ہے، جہاں جہاں اس نے مرد کی بے رحمی کو عورت کی تباہی کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے وہاں وہاں اس نے عورت کی معصومیت کو بھی خوب کامیابی سے دکھایا

ہے عورت میں معصومیت اور معصیت کے اجزاء مشترک ہیں۔ جیسا کہ مردوں میں ہے۔ منٹو نے فاحشہ عورت کے کردار کو ابھار کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ اپنے ماحول کی شکار ہے وہ صرف جینے کی خاطر زندہ ہے۔ زندگی اس کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی ہے۔

''بیگو'' منٹو کے افسانے میں شامل ہے۔ یہ ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جو اپنی معصومیت اور سادگی کی وجہ سے بہت آسانی سے خراب ہو جاتی ہے جب وہ یہ کہتی ہے'' نہ جانے مجھے لوگ برا کیوں کہتے ہیں۔ آپ بھی مجھے برا کہتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ مردوں سے ملتی رہی ہوں۔ لیکن میں بری لڑکی نہیں۔ اللہ کی قسم بے گناہ ہوں۔'' تو یقیناً اس کی قسم کو صحیح مان لینا پڑتا ہے۔ اس کے ذہن میں گناہ کا وہ مروجہ تصور نہیں ہے وہ جنسی فعل کو برا نہیں سمجھتی ہے۔ اس کے باوجود ''بیگو'' محبت سے نا آشنا رہی، اور اسے کوئی محبت کرنے والا نہ مل سکا۔ منٹو کے افسانے ایک خط بیگو، لالٹین اور نامکمل تحریر اس کے اچھے افسانے نہیں میں لیکن ان میں عورت کے کردار خاص ٹائپ کی نمائندگی کرتے ہیں۔

منٹو کے افسانوں میں عورت کے جو مختلف روپ نظر آتے ہیں وہ اس کے مرد کرداروں سے زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ اور زیادہ تر کسی نہ کسی بیماری میں مبتلا ہیں۔ ہتک کی طوائف کتے کو لے کر سو جاتی ہے۔ کالی شلوار میں بھی وہی عورت مختلف روپ میں نظر آتی ہے۔ اور اس میں ذرا اس کی شکل وصورت بدلی ہوئی، مگر دونوں کے مزاج قریب قریب یکساں ہیں۔ ممتاز شیریں نے ای کتاب ہی منٹو کے افسانوی کرداروں کے بارے میں لکھ ڈالی ہے ان کا نقطہ نظر فرائڈین ہے۔ اور وہ ''بو'' ایسے افسانہ کی گھاٹن کو دھرتی کی اصلی بیٹی کہہ کر افسانے کا تفصیلی تجزیہ کرتی ہیں۔ اور طرح طرح کی تاویلیں پیش کرتی ہیں جب کہ ''بو'' منٹو کے نہ تو اچھے افسانوں میں ہے اور نہ ہی کوئی کردار اچھی طرح ابھر کر سامنے آیا ہے۔ کلونت کور، زینت۔ لیتکا رانی، جمیلہ، جانکی، نواب، ہلاکت اور موذیل عورت کو زیادہ تر ایک گرم، اور شہوانی جوان کی صورت میں پیش کرتے ہیں، منٹو کے یہاں عورت کا کوئی مقدس تصور نہیں ہے اس کے یہاں ماں اور بہن کے کردار ضمنی ہوتے ہیں۔ بیٹی کا کردار بھی عجیب سا ہے، اللہ دتا میں زینب کا کردار ہے میں یہ نہیں کہتا کہ اس کے کردار ہماری زندگی میں نہیں ملتے ہیں، مگر اس کا پیش کرنے والا بھی صرف اس لئے معصوم نہیں ٹھہرایا جاسکتا کہ اس نے تخلیق نہیں کئے ہیں، بلکہ ہماری زندگی سے منتخب کئے ہیں۔ یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ منٹو کرداروں کو منتخب کرتے ہوئے کون سا پیمانہ سامنے رکھتا تھا۔ منٹو ایج کی خاطر ایسے کردار ڈھونڈ لیتا تھا جو اپنی غیر فطری حرکات یا مزاج کی وجہ سے جاذب نظر بن سکیں۔ اور ان کے انتخاب میں اس کے علاوہ کسی بھی نقطہ نظر کو سامنے نہیں رکھتا تھا اس نے خود جنسی تشنگی کی زندگی گزاری تھی اور طرح طرح کی عورتوں سے ملا تھا اس لئے ممتاز شیریں نے جو اس کے کرداروں کی تحلیل نفسی کرتے ہوئے ترغیب گناہ اور گناہ کے تصور کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے، وہ خود ان کے نقطہ نظر کی غمازی کرتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ منٹو عورت کو مختلف پہلوؤں سے دیکھ لینے کے بعد عورت کی عزت کرنا جان چکا تھا اور جب وہ ان کی بے بسی اور لاچاری کی داستان سناتا ہے، تو ان کی بربادی اور تشنہ زندگی کی زیادہ ذمہ داری ماحول پر ڈال دیتا ہے، اور کسی حد تک ان کو بھی مورد الزام ٹھہراتا ہے۔

منٹو کے یہ سارے کردار جبلتوں کے غلام ہیں اور عقل اور جدوجہد پر ایمان نہیں رکھتے ہیں بلکہ ان کی شخصیت کی تعمیر میں کسی نہ کسی جذبہ یا جذباتی واقعہ کا بڑا دخل رہتا ہے، ان کی سرشت میں شر کی زیادہ آمیزش ہے وہ اپنے ماحول سے بڑی جلدی مانوس ہو کر مطمئن ہو جاتے ہیں اور پھر حالات کو ناخدا بنا کر بے دست وپا ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک لحاظ سے کسی حد تک صحیح بھی ہے۔ ہمارے سماج میں آج تک عورتوں کو ان کا جائز مرتبہ نہیں دیا گیا اور وہ آج بھی مردوں کے بنائے ہوئے اخلاقیات کے تصورات کو اپنانے پر معاشی طور سے مجبور ہیں۔ لیکن اس حقیقت کو سمجھتے ہوئے بھی منٹو کے کردار معاشی قوتوں کو محرکات نہیں سمجھتے ہیں گو کہ خود اسی بدحالی کے شکار ہیں۔ یہ تضاد ایک واضح تصور حیات نہ رکھنے کی وجہ سے تھا، منٹو کے یہاں سماجی شعور کی کمی نہیں ہے۔ لیکن تاریخی شعور کا پتہ تک نہیں چلتا ہے۔ وہ کردار کو طبقات کی کشمکش اور جدوجہد کے آئینے میں نہیں دیکھ سکتا ہے کیونکہ وہ شدید قسم کی انفرادیت ہی کو فن کی معراج سمجھتا تھا اس لئے اس نے سائنٹفک نظریہ حیات کو قابل توجہ ہی نہیں سمجھا۔

اس کے افسانے موذیل کا ذکر دینا مناسب ہوگا اور تو تمام کرداروں کا تجزیہ ممکن نہیں ہے میں نے ان کی بہت سی خصوصیات کا اوپر ذکر کر دیا ہے۔ ان اشاروں سے ان کے خدوخال اور شخصیتوں کے پیچ وخم کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ البتہ موذیل ذرا تفصیل چاہتا اس لئے بھی کہ یہ اس کے بہترین افسانوں میں جگہ پاتا ہے۔ موذیل ایک آوارہ یہودن کی داستان ہے جو ترلوچن کو ایک مذہبی سکھ سے ایک ماڈرن شخص بنا دیتی ہے۔ اور آخر میں ایک سکھ لڑکی کو بچاتے ہوئے مرجاتی ہے۔ یہ افسانہ ایک ایسے کردار کو پیش کرتا ہے جو بظاہر محبت کو سنجیدگی سے نہیں اپناتا لیکن ہمیں انجام پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ آوارہ یہودن ترلوچن کے عشق میں اپنی جان تک دے ڈالتی ہے اس کے یہ جملے قابل توجہ ہیں۔

''موذیل نے اپنے بدن پر سے ترلوچن کی پگڑی ہٹا دی، لے جاؤ اس کو اپنے اس مذہب کو'' اور اس کا بازو اس کی مضبوط چھاتیوں پر بے حس گر پڑا۔'' موذیل منٹو کے تمام نسوانی کرداروں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ وہ خود محنت کر کے کماتی ہے۔ اخلاق اور رسوم سے کوئی تعلق نہیں رکھتی ہے۔ اور ترلوچن سے زیادہ ذہین ہے وہ آخر میں ایسی قربانی کرتی ہے جس کی شروع میں اس سے توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ ڈاکٹر محمد حسن نے اپنی کتاب ''ادبی تنقید'' میں اردو افسانہ کے بارے میں لکھا ہے کہ۔۔۔

''بوہیمین آرٹسٹ کا کارنامہ منفی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا نغمہ سیمرغ کے گیت کی طرح اپنے خاکستر سے دوسری زندگی کی نمود کا جوہر نہیں رکھتا ہے۔ وہ جل سکتا ہے، تعصبات کو جلا سکتا ہے۔ اسی لئے چونکا دینے والے موضوعات انہیں محبوب ہیں جنسی حقائق اور افسانوں کی پردہ داری ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ اور دبے کچلے ہوئے اور مردود کردار۔ طوائفیں، بدمعاش اور پیشہ ور مجرم ان کے ہیرو ہیں۔'' (صفحہ ۱۰۸، ادبی تنقید)

یہ بات ساری کی ساری منٹو پر منطبق کی جاسکتی ہے۔ وہ اول سے آخر تک بوہیمین تھا اور اس کے سارے کردار اس کے گردوپیش کی زندگی کی نمائندگی کرتے ہیں البتہ اس کا یہ کارنامہ ہے کہ اس نے پورے خلوص کے ساتھ ان کرداروں کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے اور فنی لحاظ سے اردو افسانہ نگاری میں کردار کی اولیت پر بھی زور دیا ہے، گو کہ اس کے زیادہ تر کردار منفی رجحانات رکھتے ہیں منٹو کے پاس کوئی حل نہیں ہے۔ بقول خود اس کے وہ ڈاکٹر نہیں ہے جو دوائی دے سکے۔ لیکن وہ مرض کی پہچان ضرور رکھتا ہے اسے یہ معلوم ہے کہ اس مرض کی سماجی بنیادیں کیا ہیں۔ مگر وہ ان کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا ہے، اس کو خیالات اور جذبات سے زیادہ اشخاص اور ان کی شخصیت کے پیچ وخم سے دلچسپی ہے وہ ''سفاک مسیحا'' بھی نہیں بننا چاہتا ہے اور نہ تماشائی رہ سکتا ہے۔ اس نے اپنے کرداروں کے ساتھ پریشانی اور مصائب بھی برداشت کئے ہیں بدنامی بھی مول لی ہے سماج کی سخت گیری کا شکار بھی ہوا ہے۔ اس کے کردار بھی اس کے باوفا دوست ہیں جنہوں نے اس کا ہمیشہ ساتھ دیا ہے، بالزاک نے اپنی ایک کہانی (آب حیات) کے شروع میں لکھا ہے کہ میرے سب سے عزیز دوست میرے افسانوں کے قاری اور کردار ہیں۔ یہی حال منٹو کا ہے سمجھتا ہوں کہ منٹو کی جواں مرگی نے ہمیں ایک فنکار سے محروم کر دیا جس کا فن اب پختہ ہو چلا تھا اور جس سے عظیم افسانوں کی امیدیں وابستہ ہو چکی تھیں وہ شہید نہیں (جیسا کہ ڈاکٹر محمد حسن کا خیال ہے) تھا۔ بلکہ کچھ ماحول اور کچھ انفرادیت کا مارا ہوا تھا۔ منٹو نے پہلی بار کردار کی عظمت کا احساس دلایا ہے اور اسی کو اس کا کارنامہ سمجھتا ہوں۔ ●

نمبر	کتاب	مصنف / مرتب	قیمت
52	اُردو کی ظریفانہ شاعری اور اس کے نمائندے	فرمان فتح پوری	۷۵/-
53	اُردو نثر کا فنی ارتقاء	فرمان فتح پوری	۴۰۰/-
54	اُردو فکشن اور تیسری آنکھ	وہاب اشرفی	۱۲۵/-
55	تاریخ ادبیات عالم (سات جلدوں پر مشتمل مکمل سیٹ)	وہاب اشرفی	۲۸۰۰/-
56	تاریخ ادب اُردو (ابتداء سے ۲۰۰۰ء تک) (تین جلدوں پر مشتمل)	وہاب اشرفی	۱۵۰۰/-
57	تفہیم البلاغت	وہاب اشرفی	۶۰/-
58	تفہیم فکر و معنی (تنقیدی مضامین) پروفیسر وہاب اشرفی،	ترتیب: ڈاکٹر ہمایوں اشرف	۱۷۵/-
59	راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری	وہاب اشرفی	۶۰/-
60	قصہ بے سمت زندگی (سوانح)	وہاب اشرفی	۴۰۰/-
61	کاشف الحقائق	وہاب اشرفی	۶۰/-
62	کافر بھی ہوئے سجدہ بھی کیا (افسانے)	وہاب اشرفی	۲۰۰/-
63	مابعد جدیدیت مضمرات و ممکنات	وہاب اشرفی	۴۵۰/-
64	مارکسی فلسفہ، اشتراکیت اور اردو ادب	پروفیسر وہاب اشرفی	۵۰۰/-
65	مثنوی اور مثنویات	مرتب: وہاب اشرفی	۵۰۰/-
66	مثنوی آب و سراب	مرتب: وہاب اشرفی	۶۰/-
67	مثنوی زہر عشق	مرتب: وہاب اشرفی	۶۰/-
68	مثنوی سحر البیان (طلباء ایڈیشن)	مرتب: وہاب اشرفی	۱۱۰/-
69	مثنوی سحر البیان (لائبریری ایڈیشن)	مرتب: وہاب اشرفی	۱۵۰/-
70	مثنوی سوز و گداز	مرتب: وہاب اشرفی	۷۰/-
71	مثنوی کدم راؤ پدم راؤ	مرتب: وہاب اشرفی	۱۱۰/-
72	مثنوی گلزار نسیم (طلباء ایڈیشن)	مرتب: وہاب اشرفی	۹۰/-
73	مثنوی گلزار نسیم (لائبریری ایڈیشن)	مرتب: وہاب اشرفی	۱۲۰/-
74	معنی سے مصافحہ	وہاب اشرفی	۲۰۰/-
75	معنی کی تلاش	وہاب اشرفی	۱۰۰/-
76	میر اور مثنویات میر	وہاب اشرفی	۲۲۵/-
77	مابعد جدیدیت اور وہاب اشرفی	ڈاکٹر شہناز خاتون	۲۲۵/-
78	نئی سمت کی آواز (تنقیدی مضامین)	پروفیسر وہاب اشرفی	۱۶۰/-
79	مابعد جدیدیت مضمرات و ممکنات (ایک جائزہ)	منصور عمر	۱۰۰/-
80	اُردو صحافت: مسائل اور امکانات	ڈاکٹر ہمایوں اشرف	۴۰۰/-
81	دریچہ آئینہ (شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں کے خطوط پروفیسر وہاب اشرفی کے نام)	مرتب: ڈاکٹر ہمایوں اشرف	۸۰۰/-
82	شناخت اور ادراک معنی (وہاب اشرفی کے تبصرے، دیباچے اور تنقیدی اشارے)	مرتب: ہمایوں اشرف	۳۵۰/-
83	متن اور مفہوم (تنقید)	ڈاکٹر ہمایوں اشرف	۲۲۵/-
84	منظوم جائزے (پروفیسر وہاب اشرفی کی تصنیفات و تالیفات)	ڈاکٹر عبدالمنان طرزی	۸۰/-
85	نکتہ نکتہ تعارف (پروفیسر وہاب اشرفی کے تبصرے اور تقاریظ)	مرتب: ڈاکٹر ہمایوں اشرف	۲۰۰/-
86	وہاب اشرفی: منفرد نقاد و دانشور	ڈاکٹر ہمایوں اشرف	۴۷۵/-
87	وہاب اشرفی شخصیت اور فن	ڈاکٹر مناظر حسن	۲۵۰/-
88	وہاب اشرفی کی افسانہ نگاری (بہار کے افسانہ نگاروں کے پس منظر میں)	امجد حیات برق	۱۷۵/-

ناول ، افسانے

نمبر	کتاب	مصنف / مرتب	قیمت
89	آگ کا دریا (گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ)	قرۃ العین حیدر	۳۵۰/-
90	اختر النساء بیگم	مصنف: نذر سجاد حیدر / مرتب: قرۃ العین حیدر	۲۰۰/-
91	پکچر گیلری	قرۃ العین حیدر	۹۵/-
92	تخیلات (مضامین کا مجموعہ)	مرتبہ: قرۃ العین حیدر	۱۶۰/-
93	جاں باز ـ ثریا (دو مشہور ناول)	مصنف: نذر سجاد حیدر / مرتب: قرۃ العین حیدر	۱۷۵/-
94	حرماں نصیب ـ آہ مظلومہ (دو مشہور ناول)	مصنف: نذر سجاد حیدر / مرتب: قرۃ العین حیدر	۱۲۵/-
95	دامانِ باغباں (مجموعہ خطوط)	قرۃ العین حیدر	۵۰۰/-
96	دل ربا ـــ اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو	قرۃ العین حیدر	۶۰/-
97	ستمبر کا چاند (رپورتاژ)	قرۃ العین حیدر	۳۲۵/-
98	سفینۂ غم دل	قرۃ العین حیدر	۲۰۰/-
99	سیتا ہرن	قرۃ العین حیدر	۹۵/-
100	شیشے کے گھر	قرۃ العین حیدر	۱۷۵/-
101	کارِ جہاں دراز ہے (اوّل، دوم)	قرۃ العین حیدر	۸۰۰/-
102	کوہ دماوند (رپورتاژ)	قرۃ العین حیدر	۲۹۰/-
103	گردشِ رنگ چمن	قرۃ العین حیدر	۷۰۰/-
104	گزشتہ برسوں کی برف	مرتبہ: قرۃ العین حیدر	۳۰۰/-
105	مذہب اور عشق	مصنف: نذر سجاد حیدر / مرتبہ: قرۃ العین حیدر	۱۰۰/-
106	نجمہ	مصنف: نذر سجاد حیدر / مرتبہ: قرۃ العین حیدر	۱۵۰/-
107	میرے بھی صنم خانے	قرۃ العین حیدر	۱۷۵/-
108	ایشہ (ناول)	مترجم: مظہر الحق علوی	۳۰۰/-
109	ایشہ کی واپسی (ناول)	مترجم: مظہر الحق علوی	۳۵۰/-
110	خانقاہ (ناول)	مترجم: مظہر الحق علوی	۲۷۵/-
111	شاہین سمندر (ناول)	مترجم: مظہر الحق علوی	۴۰۰/-
112	ظلِ ہما (ناول)	مترجم: مظہر الحق علوی	۷۰۰/-
113	فرعون کلیم (ناول)	مترجم: مظہر الحق علوی	۲۰۰/-
114	گنج سلیمان (ناول)	مترجم: مظہر الحق علوی	۱۵۰/-
115	ڈراکولا (ناول)	مترجم: مظہر الحق علوی	۴۶۰/-
116	گناہِ آدم (ناول)	مترجم: مظہر الحق علوی	۲۸۰/-
117	محبت کا طلسمی فسانہ (ناول)	ڈاکٹر ثروت خان	۲۰۰/-
118	نیا شوفر (ناول)	نوشابہ خاتون	۲۵۰/-

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi- 6 (INDIA) Ph: 23216162,23214465
Fax : 0091-11-23211540, E-mail :info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com
Website: www.ephbooks.com

● ضرر وصفی نے غزلیں بھی خاصی کہی ہیں اور نظمیں بھی۔ لیکن انہیں صرف غزل گو یا صرف نظم گو کہنے میں تکلف ہوگا۔ ہاں بنیادی طور پر وہ غزل مزاج ہیں۔ ان کی غزلیں کشش رکھتی ہیں۔ اور جہاں تک نئی غزل کا تعلق ہے انہوں نے نئی غزل کی بے راہ روی سپاٹ پن اور زبان سے کھلواڑ سے خود کو محفوظ رکھا ہے۔ ویسے کہیں کہیں نئی غزل کے ''اوصاف حمیدہ'' ان کے ہاں مل جائیں گے لیکن بس کہیں کہیں اور برائے نام۔ ایسے بھی چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

مجھ میں مجھ کو مت ڈھونڈو تم　　چھوڑ آیا ہوں خود کو گھر پر
شفق کے اندھے کنویں میں گر گیا سورج　　نہا کے نور میں شب بے لباس رہتی ہے
اصلی چہرے کو چھوڑ کر گھر پر　　نقلی چہرہ مکان سے نکلا
حادثے میں سڑک پہ پڑی لاش ہوں　　کیا تھا دنیا میں میرا مذہب طے کرو

(سلیمان اطہر جاوید)

حیدر آباد کے معروف شاعر

ضــــرر وصــــفی

کو ماہنامہ شاعر کے خصوصی گوشے ''کل آج اور کل'' (دسمبر ۲۰۰۷ء) میں پیش کیا گیا تھا۔ شاعر کے عالمی اردو قارئین نے ضرر وصفی کی شعری کائنات کو سمجھ لینے میں تاخیر نہیں کی تھی۔ ضرر وصفی کا تخلیقی سفر زمین سے فلک ہو جانے تک کی خواہش سے نمو پا رہا ہے اور اب ان کا چوتھا شعری مجموعہ

ســاغـر حـرف

بھی شائع ہو گیا ہے۔ ضرر وصفی زود گو شاعر ہیں۔ ابھی کئی شعری مجموعوں کا لوازمہ ان کے پاس جمع ہے۔

ساغر حرف ہے خواب سے بھرتے دیکھا　　شعر میں قاف کی پریوں کو اترتے دیکھا

کوہ قاف کی شعری پریاں یہاں ساغر حرف سے قبل شب چراغ، نسبت بے ستون، اور حرف حرف لہو لہو میں اتر چکی ہیں۔ اب یہ شعری پریاں شاعری کی مختلف النوع اصناف کا روپ اختیار کر کے اپنے شاعر کے سوچ کینوس پر جو شعری کائنات تخلیق کر رہی ہیں۔ اسے ضرر وصفی نے پیش کر دیا ہے۔ اس مجموعے میں غزلیں، پابند و آزاد نظمیں، قطعات، حمد و نعت، سلام، تمام شعری ساماگری میں ضرر وصفی، دھنک رنگ لہجے اور زمین میں بھرا اسلوب میں خامے کامیاب نظر آتے ہیں۔

اللہ کے سوا کون مددگار ہے تیرا　　کہنے کو نمائش کے کئی یار ہیں تیرے
خاموش تماشائی ہیں گونگوں کی طرح سب　　یہ دست تہی تیرے ہی ہتھیار ہیں تیرے

مختصر نظموں میں ضرر وصفی کا شعری بہاؤ بے طرح دبیز گہرا، اور منفرد ہے۔

ماضی: سختیاں حوادث کی / تلخی غم و آلام / یادیں میرے ماضی کی / صبح و شام میرے ساتھ / ایسے لپٹے رہتے ہیں / جیسے سانپ صندل سے! /

ایک اور مختصری نظم ملاحظہ کیجئے۔

☆ سمندر کا سفر / میلوں کی مسافت / حد نظر تک پانی ہی پانی / میرے مصائب میرا کرب نہانی / اضطراب آسا موجیں / رقم کر رہی ہیں / سمندر پہ میرے سفر کی کہانی۔ /

اولین شعری مجموعے سے تازہ شعری کینوس تک ضرر وصفی نے جو تخلیقی سفر طے کیا ہے۔ اس میں ان کے یہاں معمولی سی بھی تکان نہیں ملتی۔ وہ ہنوز تازہ دم ہیں اور تخلیقی سفر ابھی جاری ہے۔

دل میں جیسے روشن ہو دفعتاً کوئی قندیل　　جسم میں لہو بن کر آ گئیں ہوں تحلیل
سینہ مقدس میں نور کا سمندر ہے　　وا کرے ہے در کتنے جنبش لب جبریل

گویا ضرر وصفی کی شاعری آمد اور فلک سے نور بن کر اتری ہوئی ہے۔ تمام شعری لوازمہ گواہی دے رہا ہے کہ ابھی پڑاؤ کوسوں دور ہے۔

ضخامت: ۱۴۴ صفحات ☆ قیمت: ۲۰۰ روپے / ۵۔ امریکی ڈالر ☆ سنہ اشاعت: ۲۰۱۲ء

دستیاب ہے:

ضرر وصفی 233.M.C، ملک پیٹ کالونی، حیدر آباد۔ ۵۰۰۰۳۶ (آندھرا پردیش)

موبائل: 09848197429

نریش کمار شاد

منٹو

(جس کی کہانیاں ہی باقی رہ گئی ہیں)

امرتسر کے "شیراز ہوٹل" میں کچھ بے فکرے آپس میں گپ شپ لڑا رہے تھے۔ دفعتہً ایک دبلے پتلے نوجوان کی آنکھوں میں مسکراہٹ کی ایک تیز سی لہر دوڑی اور اس نے دھیرے سے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"دیکھو ابھی تمہیں ایک مزہ دار کھیل دکھاتا ہوں۔"

اور دوسرے ہی لمحہ اس ہوٹل میں داخل ہوتے ہوئے اس نے ایک متین سے شخص کو پکارتے ہوئے کہا" آہا عاشق صاحب آیئے آیئے قبلہ تشریف لایئے کہیے مزاج کیسا ہے ----فرمایئے کیا پئیں گے آپ--- چائے--- بھئی ایک کپ چائے اور بھیج دینا۔"

اور عاشق کو اپنے پاس بٹھا کر ان رسمی جملوں کے بعد اس نے بڑی سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔" یارو لاہور کی بھی کیا بات ہے اور واقعی جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا"--- اور وہ اپنے لذیذ اور لچکتے ہوئے انداز میں لاہور کی شان میں زمین آسمان کے قلابے ملانے لگا۔

"آرے اور تو اور لاہور میں حکومت نے ٹریفک کے سپاہیوں کو بھی اب برف کے کوٹ مہیا کر دیئے ہیں۔"

"برف کے کوٹ؟" عاشق نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے پوچھا۔ اور اس کا چہرہ سوالیہ نشان کی طرح لٹک گیا۔

"ہاں قبلہ! برف کے کوٹ۔ آپ حیران کیوں ہو رہے ہیں عاشق صاحب! حضرت یہ سائنس کا دور ہے سائنس کا۔ ریڈیو۔ ہوائی جہاز۔ سینما۔ بجلی کے پنکھے--- ارے بھائی سائنس کی شعبدہ کاری کی کوئی حد ہے۔ ابھی برف کے کوٹ ہی بنے ہیں۔ آگے آگے دیکھیے۔"

اور عاشق نے پریشان سا ہو کر اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا" میرا دماغ تو تسلیم نہیں کرتا۔ ارے میاں کبھی برف کے کوٹ بھی سل سکتے ہیں۔ کیسی بے تکی ہانک رہے ہو؟"

حضور عاشق صاحب!" وہ بڑی گمبھیرتا سے بولا" سائنس کے اتنے بڑے تلاطم خیز طوفان کے سامنے آپ کے اس بھولے بھالے اور چھوٹے سے دماغ کی کیا حیثیت ہے، آپ فرما رہے ہیں برف کے کوٹ سل کیونکر سکتے ہیں اور آپ کے سائنسدانوں نے سی کر بھی دکھا دیئے ہیں۔ جناب میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ ایسے کوٹ، لاہور کے چوراہوں پر جا بجا ٹریفک کے سپاہیوں نے بڑے ٹھاٹ سے انھیں پہن رکھا تھا۔"

اور عاشق کے دل و دماغ کو حیرت و استعجاب کے بھنور میں ڈال کر وہ دوسرے دوستوں کے ساتھ کسی اور موضوع پر بات چیت کرنے لگا۔

اس واقعہ کے تقریباً چوبیس گھنٹے بعد، اپنے خوش طبع دوستوں کے ساتھ جب وہ اپنے معمول کے مطابق "شیراز" میں داخل ہونے لگا تو کھٹ سے عاشق آگے بڑھا۔ اس کا گریبان پکڑ لیا اور بغیر کچھ کہے سنے دیوانہ وار اس پر ٹوٹ پڑا۔ چند ہی منٹ کے بعد دونوں کی قمیص پھٹ چکی تھیں۔ ایک کے منہ اور دوسرے کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ پورے ہوٹل میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ لوگوں نے جب بڑی مشکل سے بیچ بچاؤ کیا تو عاشق ہانپتے ہوئے دانت پیس پیس کر کہنے لگا۔" ارے خدا کی مار تجھ یاوہ گو لفنگے اور لعنتی پر۔ تجھے پالا نہیں پڑا کبھی مجھ جیسے آدمی سے بیناؤ پٹائی کروں گا کہ دماغ کے چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔"

ہوٹل والوں نے عاشق کو ٹھنڈا کرتے ہوئے جب اصل بات دریافت کی تو وہ چیخ چیخ کر کہنے لگا۔" اجی! اس کمبخت کل کے چھوکرے نے مجھے بیوقوف سمجھ رکھا ہے کیا؟ میں ابھی ابھی لاہور سے آرہا ہوں۔ قسم قرآن شریف کی وہاں کسی سپاہی کے پاس برف کا کوٹ نہیں تھا۔ آپ ہی کہیے میں کوئی دیوانہ ہوں۔ پاگل ہوں، سڑی سودائی ہوں جو اس باتونی نے مجھے یوں خراب کیا۔"

اور ان دونوں میں سے کسی نے ہنستے ہوئے کہا۔" نہیں نہیں عاشق صاحب! آپ تو خدا کے فضل سے بڑے سمجھ دار آدمی ہیں۔ خرابی تو اسی سعادت حسن منٹو کے دماغ میں ہے، جو ایسی باتیں کرتا ہے۔"

دوستوں کے ساتھ چہک چہک کر باتیں کرتے کرتے اور وہ اچانک مہک گیا۔

سب سے پہلے اس نے وہسکی کی خالی بوتل کو پاش پاش کیا اور اس کے بعد ایک ایک کر کے خالی گلاسوں اور بلوری پلیٹوں کو چکنا چور کر دیا۔ اور اس کے بعد جب بیرا بل لے کر آیا تو اس کی مدہوش آنکھوں میں اس کی کھلنڈری ذہانت کی جوت جگمگا اٹھی۔

"اس بل میں ٹوٹے ہوئے گلاسوں اور پلیٹوں کی قیمت کیوں شامل کی گئی ہے؟" اس نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے بیرے کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

"صاحب! یہاں کا دستور یہی ہے۔"

"دستور کے بچے! منیجر کو بلا کر لاؤ۔" اس نے غراتے ہوئے بیرے سے کہا۔ پھر خود ہی اپنے اس انداز گفتگو پر شرمانے کی بجائے مسکرانے لگا۔

اور جب منیجر اپنے خشم آلود چہرے کے ساتھ اس کے سامنے آیا تو وہ بھی سنجیدہ ہو گیا۔

"کیوں جی! آپ کی بار میں جو گلاس یا پلیٹیں ٹوٹ جائیں ان کی قیمت بھی آپ اپنے گاہکوں سے وصول کرتے ہیں۔؟"

"جی ہاں---- اور اصول بھی یہی ہے۔" منیجر نے نہایت حلیمی اور متانت سے جواب دیا۔

"اچھی بات۔"

اور یہ کہہ کر سعادت حسن منٹو نے انتہائی خاموشی اور سکون کے ساتھ بل ادا کر دیا۔

ایک ہفتہ کے بعد وہ انھیں دوستوں کے ساتھ پھر اسی بار کی اسی کیبن میں آدھمکا۔ حسب سابق چہک چہک کر باتیں کرنے لگا اور اس کے دوستوں کے ساتھ بار کی پوری فضا بھی ٹھنڈے دل سے اس لمحہ کا انتظار کرنے لگی جب وہ چہکتے چہکتے اچانک بہک جائے گا، لیکن بہکنے کے بجائے وہ دفعتاً دھماکے کی طرح پھٹا۔

"سانپ----- ارے سانپ۔"

اس کی کپکپاتی ہوئی آواز بار کی سرد اور جامد فضا میں بجلی کی گرم گرم تیز اور چمکیلی رو کی طرح دوڑ گئی۔

اور بار کے فرش پر واقعی سانپ کو رینگتے ہوئے دیکھ کر سب گاہکوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ سراسیمہ ہو کر جب وہ بھاگنے دوڑنے لگے تو کئی میزیں اور کرسیاں اوندھی ہو کر گر پڑیں۔ اور کھانے کی کئی پلیٹیں اور پینے کے کئی گلاس اس افراتفری کی نذر ہو گئے۔

چند لمحوں کے بعد جب سانپ کو ہلاک کر دیا گیا تو اس نے بیرے سے بل طلب کیا اور بل کو دیکھتے ہی منیجر کو طلب کیا اور منیجر کے متین چہرے کو دیکھ کر اس کی مدہوش آنکھوں میں پھر اس کی مخصوص ذہانت کی جوت جگمگا اٹھی۔

"آج آپ نے بل میں ٹوٹے ہوئے گلاسوں اور پلیٹوں کی قیمت کیوں شامل نہیں کی؟؟"

اور اس کے اس سوال پر منیجر کے چہرے کی متانت اور گہری ہو گئی۔

وہ "تو سانپ کی وجہ سے ٹوٹی ہیں جناب! اس میں گاہکوں کا کیا قصور ہے؟"

"لیکن یہ آپ کے اصول کے تو منافی ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے فقرہ کسا اور پھر بٹوے میں سے کچھ نوٹ نکال کر منیجر کے حوالے کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"مگر معاف کیجئے مجھے کوئی فرق محسوس نہیں ہوا۔"

منیجر پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اور وہ اپنے دوستوں کے ساتھ جب اٹھ کر باہر چلنے لگا تو منیجر کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"منیجر صاحب پچھلی مرتبہ جب آپ کی پلیٹیں ٹوٹی تھیں تو آپ نے کھانے پینے کے اخراجات کے علاوہ کراکری کے تین روپے زیادہ چارج کئے تھے اور آج جب آپ کی پلیٹیں ٹوٹی ہیں تو مجھے یہ تین روپے آپ کو ادا کرنے کے بجائے یہاں آنے سے پہلے ایک سپیرے کو دینے پڑے ہیں۔"

"سپیرے کو۔"

منیجر نے ہکا بکا ہو کر پوچھا۔ "جی ہاں۔ جس سانپ کو آپ لوگوں نے مار دیا ہے۔ میں اسے تین روپے میں خرید کر یہاں لایا تھا۔"

منٹو صاحب! پچھلی دفعہ جب آپ کو دیکھا تو آپ سے یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی تھی کہ آپ نے شراب سے توبہ کر لی ہے۔ مگر کتنے افسوس کی بات ہے کہ آج آپ پھر پئے ہوئے ہیں۔"

"جی ہاں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اُس دن آپ خوش تھے اور آج میں خوش ہوں۔"

"جی چھوڑیئے او پندر ناتھ اشک کی بات۔ آپ بھی کس دوزخی کا ذکر لے بیٹھے۔ بے حد بخیل ہے سالا۔ پرلے درجے کا بخیل۔ سنیئے خوب یاد آیا۔ اشک کی بخیلی کا ایک چھوٹا سا واقعہ سنیئے۔" اور اس تمہید کے بعد منٹو نے اپنی پیشانی کو سکیڑتے ہوئے کہا "کم بخت نے ایک بلی پال رکھی ہے۔ جی ہاں بلی۔ صبح سویرے ہی اسے اڑوس پڑوس کے گھروں میں بھیج دیتے ہیں اور وہ شطونگڑی کہیں نہ کہیں سے آنکھ بچا کر دودھ پی کے جب واپس آجاتی ہے تو اشک صاحب بلی کو الٹا لٹکا کر اس کے پیٹ سے سب وہ دودھ باہر نکال لیتے ہیں۔ اور پھر اسی دودھ سے چائے بنا کر پیتے ہیں۔ جی ہاں میں سچ کہہ رہا ہوں۔ نہیں صاحب سنی سنائی بات نہیں آنکھوں دیکھی بات ہے۔ میں خود ان کے ہاں اس دودھ کی چائے پی چکا ہوں۔"

سعادت حسن منٹو جب کچھ مہینے پاگل خانہ میں رہ کر باہر آیا تو دوست احباب اس کے گھر میں خیر و عافیت پوچھنے کے لئے آئے۔

منٹو نے بڑی حسرت سے بتایا کہ بھائیو! چھوٹے پاگل خانہ سے نکل کر بڑے پاگل خانہ میں آگیا ہوں۔

جب منٹو کے افسانے "ٹھنڈا گوشت" پر کچھ "با اخلاق" لوگ بدک اٹھے تو منٹو کے ایک دوست نے اُس سے کہا۔

"لاہور کے کچھ سرکردہ شخصیتوں نے ارباب عدالت سے شکایت کی ہے کہ آپ نے ایک افسانہ "ٹھنڈا گوشت" لکھا ہے جس کی بدبو دور تک پھیل گئی ہے۔"

منٹو نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"کوئی بات نہیں میں ایک اور افسانہ "تھرما میٹر" لکھ کر ان کی یہ شکایت رفع کر دوں گا۔"

وہ ایک شاعر دوست کے ساتھ شہر میں گھوم رہا تھا۔ راستے میں ایک مکان کے بڑے دروازے کی پیشانی پر لکھا ہوا تھا کہ اس عمارت کو فلاں سن میں فلاں رائے بہادر نے تعمیر کروایا تھا۔

شاعر نے یہ تحریر پڑھنے کے بعد اُس کی طرف رجوع کرتے ہوئے کہا۔

"خدا جانے منٹو میری موت کے بعد میرے مکان کے دروازے پر کیا لکھا جائے گا؟"

"کرائے کے لئے خالی ہے۔" اُس نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

سعادت حسن منٹو سے جب احمد ندیم قاسمی کا کیریکٹر اسکیچ لکھنے کی فرمائش کی گئی تو منٹو اداس ہو کر بجھے بجھے لہجہ میں کہنے لگا۔

قاسمی کا اسکیچ۔۔۔۔ وہ بھی کوئی آدمی ہے یار۔۔۔۔ جتنے صفحے چاہے سیاہ کروالو۔ لیکن ہر بار مجھے یہی جملہ لکھنا پڑے گا کہ قاسمی بہت شریف آدمی ہے۔"

بقیہ صفحہ ۴۳ منٹو کی موت پر

کہنے کو تو یہ بات میں نے جوش پر بھی واضح کر دی ہے۔ لیکن وہ کیوں ایسا کرنے لگے۔ ......انہیں تو جس "جام جم" کی ضرورت ہے وہ مل جاتا ہے۔

کچھ رک کر وہ پھر کہنے لگا۔ ممکن ہے جب میں مر جاؤں تو...... لیکن ابھی تو میں زندہ ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے پنسل توڑ دی...... کاغذوں کے پرزے کر دیے...... اور شراب کی بوتل منہ سے لگالی...... پھر آپ ہی منہ سے ہٹالی۔ اور کہنے لگا...... "خالی ہے" اس نے بوتل کو خلاء میں اچھال دیا۔ خالی بوتل زمین پر گرتے ہی ٹوٹ گئی۔ سعادت حسن منٹو مر گیا۔ اور میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ جو خیال ہوتے ہیں وہی خواب بن جاتے ہیں۔

جس رات اس کا انتقال ہوا۔ اس رات میں وہ میرے پاس آیا اپنا خواب یاد کر کے میں مسکراتا رہا۔ پھر تین دن بیت گئے۔ ایک دن صبح صبح ہی کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے اٹھ کر کواڑ کھول دیئے۔ میرے سامنے ممدو کھڑا تھا۔ خلاف معمول اتنے سویرے آنے پر میں نے اس سے سوال کیا۔ وہ کہنے لگا...... سعادت حسن منٹو کا پتہ بتا دیجئے۔ کیوں! تم کیا کرو گے۔ "بس...... اگر بتا سکتے ہو تو بتا دیجئے۔ وہ منہ بند ہے۔ "میں نے اسے پتہ بتا دیا۔ میرے بہت اصرار کرنے پر بھی اس نے مجھے نہیں بتایا کہ وہ منٹو کا پتہ کیوں مانگ رہا تھا۔ اس واقعے کو کئی دن گزر گئے۔

اتفاق سے کل جب ممدو اپنی جیب سے بیڑی کا بنڈل نکال رہا تھا۔ تو اس کے ساتھ ایک رسید بھی نکل کر زمین پر گر گئی۔ رسید میں نے اٹھالی...... اور پڑھنے لگا۔ رسید پر سعادت حسن منٹو کا پتہ لکھا ہوا تھا...... وہ دس روپے کے منی آرڈر کی رسید تھی۔ جو کہ ممدو نے منٹو کے گھر بھیجے تھے۔ میں نے ممدو کی جانب دیکھا...... وہ بہت اداس تھا...... اس کی آنکھوں میں چمک تھی...... اس نے بتایا کہ اُس نے یہ روپے قرض لے کر بھیجے ہیں وہ آہستہ آہستہ یہ قرض ادا کر دے گا...... آہ غریب رکشے والا ممدو...... اور میرے منہ سے بے اختیارانہ طور پر نکل گیا۔ اکثر خالی بوتل سے خالی بوتل ہی گرتی ہے۔ مگر کانٹوں میں پھول ہی کھلتے ہیں۔ ●

تصور زبیری

منٹو کی موت پر

سعادت حسن منٹو مر گیا......؟ "سنا تو ایسا ہی ہے" کسی نے کہا" رات کے سناٹے میں دو آوازیں اُبھریں اور وہ کہیں اندھیرے میں ڈوب گئیں۔ رات تاریک...... خبر بھیانک ...... جیسے اندھیرے میں کسی نے اور سیاہی گھول دی ہو۔

اس نے ایک سرد آہ کھینچی اور اپنی گردن جھکا لی جیسے کسی نے من بھر بوجھ اس کے سر پر رکھ دیا ہو...... ایک وقفہ کے بعد اس نے کہا۔ "یار کل ہی تو تم نے اس کا افسانہ...... وہ "ٹوبہ ٹیک سنگھ" سنایا تھا۔ میں چپ بیٹھا رہا۔ اس نے پھر سوال کیا۔ "کیا اس کے بیوی بچے بھی ہیں۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا...... پھر اس نے پوچھا" منٹو شراب پیتا تھا۔" میں نے پھر "ہاں۔" کہا...... اور چپ ہو گیا...... باہر گلی میں آہستہ آہستہ سرد ہوائیں۔ سسکیاں بھر رہی تھیں...... جیسے جیسے رات بڑھ رہی تھی، ویسے ہی ویسے ہوا میں خنکی بڑھ رہی تھی۔ انگیٹھی میں کوئلے سلگتے سلگتے راکھ ہو گئے تھے...... منٹو کے مرنے کی خبر سن کر وہ اس طرح افسردہ ہو گیا تھا جیسے اس کا کوئی قریبی عزیز انتقال کر گیا ہو۔ محمد و تھا...... وہی محمد و جو مجھے "اردو کانفرنس" میں ملا تھا۔ اور جس نے اردو کے لئے دستخط کرانے میں میری کافی مدد کی تھی۔ یہ اس کی اردو زبان سے دلچسپی کا بہترین ثبوت تھا۔ اسے افسانوں اور کہانیوں سے عشق تھا۔ ویسے وہ زیادہ پڑھا لکھا آدمی نہ تھا۔ لیکن پھر بھی اکثر وہ افسانوں وغیرہ کی کتابیں اور رسالے مجھ سے لے جاتا۔ انہیں پڑھتا۔ جو الفاظ اس کی سمجھ میں نہ آتے تو ان کے نیچے خط کھینچ لیا کرتا تھا۔ اور ان خط کشیدہ الفاظ کا مطلب اکثر مجھ سے یا کسی بھی پڑھے لکھے آدمی سے معلوم کر لیا کرتا تھا۔ اس طرح اردو کے بہت سے اور نت نئے الفاظ اُس کو یاد ہو چلے تھے...... وہ رکشا چلایا کرتا تھا اور اکثر افسانوں وغیرہ کی کتابیں اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اور جب رکشا خالی ہوتی۔ تو اس کو ایک طرف کھڑا کر کے اس میں ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر "بڑے اطمینان" سے افسانے اور کہانیاں پڑھا کرتا...... اور اُن میں کھو کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا...... اسی لئے وہ منٹو سے بھی واقف تھا۔ اُس دن جب اس نے مجھ سے یہ خبر سنی تو اس کو بہت افسوس ہوا۔ کافی دیر تک وہ میرے پاس افسردہ سا بیٹھا رہا۔ پھر آہستہ سے اُٹھا اور مجھ سے اجازت چاہے بغیر کمرے سے نکل گیا۔

رات کافی بیت چکی تھی۔ اس لئے روشنی بجھا کر میں بھی پلنگ پر لیٹ گیا۔ رات کے بیکراں سناٹے میں۔ اچانک مجھے سعادت حسن منٹو کی یاد آئی میں سوچنے لگا۔ کاش وہ کچھ دن اور زندہ رہتا۔ لیکن دل نے کہا کچھ دن بعد بھی اُس کو مرنا ہی تھا...... موت برحق ہے ہر انسان کو آنی ہے۔ اور منٹو قیامت کی بوریاں سمیٹنے کو تھوڑی ہی پیدا ہوا تھا...... شیکسپیئر، ملٹن، شیلی، کیٹس، گورکی، حافظ، سعدی، سودی، کالی داس، غالب، اقبال اور پریم چند۔ وغیرہ بھی ہمیشہ زندہ نہ رہ سکے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اُن کا نام زندہ ہے۔ میں نے سوچا کہ وہ ایک بڑا افسانہ نگار تھا۔ جہاں اس نے جنسیات کی کیچڑ میں لت پت افسانے تخلیق کیے۔ وہاں اُس نے گھناؤنے سماج کی گندگی کو بھی کرید کر سب کے سامنے رکھ دیا۔ جہاں اس کے بعض افسانے جنسی لذت کا چٹخارہ دیتے ہیں وہاں اس نے سماج کی دکھتی رگوں پر بھی انگلیاں رکھی ہیں۔ اور بعض افسانوں میں تو پہلے وہ ڈھیر سے ڈھیر سے پیار کرتا اور پیار کرتے کرتے ایک ایسا زوردار طمانچہ مارتا کہ قاری کا ذہن جھنجھنا اُٹھتا۔ منٹو یا اس کا فن کیا چاہتا تھا۔ یہ میں تو کیا اچھے اچھے لوگ نہیں سمجھ سکے۔ شاید وہ خود بھی نہیں سمجھ سکا۔ لیکن وہ اتنا ضرور کہا کرتا تھا۔ اگر وہ ہندوستان کے علاوہ کہیں اور پیدا ہوا ہوتا تو بہت بڑا آدمی ہوتا۔ منٹو نے اردو ادب کو بڑے اچھے افسانے دیئے حال ہی میں اس نے "پھوجا حرامدا" "مختار" "ٹوبہ ٹیک سنگھ" "شاہ دولے کا چوہا" ...... قسم کے سیکڑوں لازوال افسانے تخلیق کیے۔ ...... سعادت حسن منٹو مر گیا...... کچھ بھی نہ ہوا...... میں سوچنے لگا...... میں سوچنے لگا...... لیکن مر گیا تو کیا ہوا...... اس کے لئے پہاڑ تو گر نہیں سکتے ہیں...... دریا تو سوکھ نہیں سکتے...... اور دنیا تو مر نہیں سکتی ہے...... میں سوچتا رہا...... سوچتا رہا ...... منٹو اور اس کے فن کے بارے میں...... رات قریب ایک تہائی بیت چکی تھی...... آسمان پر تارے تھے...... چاند تھا...... اور نیچے سیاہی میں ڈوبا ہوا اُجیارا تھا...... ڈھیر سے ڈھیر سے چاند تارے سب غائب ہو گئے اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ زمین پر روشنی ہو رہی ہے اور آسمان پر اندھیرا ہے...... جیسے چاند تارے زمین پر اُتر آئے ہوں...... پھر ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں مجھے لوریاں دینے لگیں...... لیکن میں سو نہ سکا...... اس لئے کہ منٹو کی موت کا اثر گہرا تھا۔

پھر منٹو کی موت جیسے خواب و خیال ہو گئی...... منٹو زندہ تھا...... وہ میرے سامنے کھڑا ہوا تھا اس کو دیکھ کر مجھے تعجب نہ ہوا اُس کے بال اُسی طرح بڑھے ہوئے تھے۔ ہونٹ اسی طرح خشک تھے...... چہرہ ویسے ہی سنجیدہ تھا...... آنکھوں پر وہی چشمہ تھا۔ اس وقت اس کے پاس تن کے کپڑوں سمیت چھ چیزیں تھیں...... ایک کرتا...... ایک پائجامہ...... ایک عینک ایک پنسل ایک کاغذ کا بنڈل...... اور ایک بوتل...... وہ میرے قریب آ کر بیٹھ گیا...... کہنے لگا...... کس نے کہا کہ میں مر گیا ہوں...... میں تو زندہ ہوں...... سب جھوٹ بولتے ہیں...... سب جھوٹ بولتے ہیں...... فنکار کبھی نہیں مرتا۔ شیکسپیئر زندہ ہے...... گورکی زندہ ہے...... غالب، اقبال اور پریم چند زندہ ہیں...... میں نے جواب دیا" اس لحاظ سے تو تم بھی زندہ ہو۔"...... اس نے آنکھیں نکال کر کہا...... نہیں میں ہر لحاظ سے زندہ ہوں...... اس کے بعد وہ کہنے لگا......

"اگر میں افسانہ نگاری کے بجائے چور بازاری کرتا تو آج میں شراب سے نہ ترستا...... مجھے اپنی موت کے بعد اپنی بیوی بچوں کی یوں فکر نہ ہوتی...... لیکن میں نے بہت بڑی غلطی کی جو افسانے لکھے...... آج میں تم سے آخری بار ملنے آیا ہوں اور یہ کہنے آیا ہوں۔ کہ اگر تم مضمون نگاری۔ افسانہ نگاری۔ یا شاعری کرتے ہو تو چھوڑ دو یہ سب کچھ۔ اگر تم اپنے تمدن کے قائل ہو تو آج ہی اس گھروندے سے باہر نکل آؤ۔ دل پر پتھر رکھ کر وہی کرو جس کی آج دنیا ہوتی جاری ہے۔ اگر تم (rationalisim) اقلیت کے قائل ہو۔ تو اب بھی وقت ہے چلو بھر پانی میں ڈوب مرو...... اس کے بعد کچھ دیر کے لئے منٹو چپ ہو گیا۔ اور پھر یوں گویا ہوا...... میں اس وقت کرشن چندر کے پاس سے آ رہا ہوں...... اس سے کہہ آیا ہوں کہ تو بھی اپنا جام فکر توڑ کر پھینک دے...... یہاں ادیب کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔

(باقی صفحہ ۴۲ پر دیکھئے)

ضیا عظیم آبادی

منہ پھٹ

مہین سی آواز۔ کھلتا ہوا رنگ۔ عینک کے اندر تڑپتی ہوئی بے نور آنکھیں۔ اور سوکھا مارا جسم۔ اچانک نظر پڑ جاتی تو بنگال کا قحط دیا آجاتا۔ اور بے اختیار تھوڑا سا چاول دے دینے کو ہاتھ بڑھتے مگر فوراً ہی رک جاتے۔ ارے یہ تو ہندوستان و پاکستان کے مشہور فن کار سعادت حسن منٹو ہیں۔۔ وہی منٹو جن کی آواز بند کرنے کے لئے مقدمے چلائے گئے جنھیں عریاں نگار فحش نویس اور منہ پھٹ کہا گیا۔ جنھیں بدتمیز اور آوارہ سمجھا گیا۔ مگر آوارگی کرنے کی ان میں سکت ہی کب تھی بلکہ ڈھ کٹ پائجامہ اور قمیص پہن کر تو مستقل بانس معلوم ہوتے تھے سوٹ میں تو پھر کچھ بھرم رہ جاتا تھا۔

بمبئی میں میں نے اپنا اسٹیج ڈرامہ "پہلی ٹھوکر" دیکھنے کی دعوت دی انھیں وہ آئے عصمت۔ شاہد لطیف اپنی چھوٹی بہن اور شریک زندگی صفیہ کو بھی ہمراہ لائے۔ انٹرویل میں باتیں ہونے لگیں۔ میرے منہ سے بیساختہ نکل گیا۔ منٹو بھائی تم سے زیادہ جاندار تو صفیہ بھابی ہیں۔ برجستہ بولے ہاں یار کہتے تو ٹھیک ہو، مگر شاہد اور عصمت کو دیکھ کر تسکین ہو جاتی ہے کم از کم ان دونوں کی طرح تو ہم لوگوں میں فرق نہیں ہے۔ عصمت جھینپ گئیں، شاہد لطیف شرما گئے۔ اور وہ ان دونوں کو دیکھ کر ہنسنے لگے۔

ہنستے خوب تھے کبھی منہ پر میل نہیں آنے دیتے تھے۔ غمگین ہونا زندگی کی دوڑ میں شکست کھانا سمجھتے تھے۔ اور یہ شکست کھانا انھیں بالکل گوارا نہ تھا۔ ماں سے بہت محبت کرتے تھے، بمبئی ہی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ سینہ تان کر تجہیز و تکفین کا سامان کرتے رہے بلکہ قبرستان کے اصولوں پر روشنی ڈالتے رہے اور فارغ ہوتے ہی اس نئے تجربے کو فن سے ہم آغوش کر کے ایک کہانی لکھ بیٹھے۔ لڑکا مر گیا، بھولا بھالا پھول سا بچہ۔ مگر ان کے ماتھے پر شکن بھی نہ آئی۔

وہ زندگی کی گہرائیوں میں پہنچنے کے شوقین تھے۔ خارجیت سے زیادہ داخلیت کے دلدادہ تھے اور ایسی باتیں کہنا چاہتے تھے جنھیں دوسرے کہتے ہوئے شرم محسوس کرتے تھے۔ اسی لئے بدنام تھے لیکن انھیں اپنی اس بدنامی کی پرواہ نہ تھی۔ ان کی نیت بخیر تھی۔ انھیں اپنے اخلاص پر بھروسہ تھا۔ اپنی صداقت کا یقین تھا۔

ان کا قلم کبھی کبھی بہت شوخ ہو جاتا تھا۔ مگر خود ان میں شوخیاں کرنے کی زیادہ صلاحیت نہ تھی۔ جان تھی ہی نہیں، اپنے کرداروں کو چست و چالاک دیکھ کر مسرور ہو جایا کرتے تھے۔ گفتار کے غازی تھے لیکن کردار کے نہیں۔ لکھتے سب کچھ تھے مگر خود مختار تھے۔ میری ان کی پہلی ملاقات دہلی ریڈیو اسٹیشن پر ہوئی وہ وہاں ملازم تھے اور میں دیہاتی پروگرام میں کبھی کبھی حصہ لیا کرتا تھا۔ اکثر عورتیں ان سے متاثر تھیں مگر وہ کسی سے مرعوب نہ ہوتے تھے۔ ان کی ازدواجی زندگی بڑی کامیاب تھی۔ صفیہ ان سے محبت کرتی تھیں اور وہ صفیہ سے۔

فلمی دنیا میں مدتوں رہے۔ نسیم کا بہت ساتھ رہا۔ کبھی کسی نے پری چہرہ کے جمال جہاں آرا کے بارے میں پوچھا تو مسکرا کر بولے حسن ہے مگر بے حد ٹھنڈا۔

عصمت چغتائی کے بڑے معترف تھے۔ کہتے تھے متوسط گھروں کی زندگی کا نقشہ کھینچنے میں اس عورت کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ بڑی غضب کی لکھنے والی ہے۔ حجاب کو ادبِ عالیہ کی صف میں رکھتے تھے۔ رائے دینے میں کسی قسم کا لحاظ نہیں کرتے تھے۔ نہ مروت میں آکر مغالطہ پیدا کرتے تھے۔ میرے افسانوں کا مجموعہ "صبح و شام" جب لاہور سے چھپ کر آیا تو میں نے ایک جلد ان کو بھی دی اور اظہار خیال کے لئے کہا۔ انھوں نے بڑی صاف گوئی سے بتایا کہ بس اس میں ایک کہانی "پردہ میں زردہ" خوب ہے۔ بقیہ تو یوں ہی ہیں۔

جلدی گھلتے ملتے نہ تھے بہت دیر آشنا تھے۔ پہلی نظر میں ممکن ہے اکھل کھرے اور بیزار دکھائی دیتے ہوں۔ لیکن قریب ہونے کے بعد بڑے بے تکلف۔ انتہائی دوست پرست اور پُر خلوص انسان ثابت ہوتے تھے۔

میں ان سے بہت متاثر تھا اور کوشش کر کے مراسم بڑھا رہا تھا۔ بائیکلہ بمبئی کے اڈلفی چیمبر میں دو کمرے کا فلیٹ ان کے پاس تھا۔ اکثر وہیں نشست ہوتی تھی۔ میرے ہمراہ اکثر بیوی بھی جاتی تھیں۔ صفیہ بھابی بڑے دھوم دھام سے ناشتہ کراتی تھیں اکثر ان کی دو چھوٹی بہنیں اور والدہ بھی ہوا کرتی تھیں۔ نہ جانے کہاں کہاں کی باتیں نکل آتیں اور ایسا معلوم ہوتا جیسے ہم سب ایک ہی کنبے کے چند افراد ہیں۔ اجنبیت اور غیریت کا احساس فنا ہو جاتا تھا۔ منٹو کے گھر کا ماحول ہی پُر خلوص تھا۔ بناوٹ اور تصنع کا کہیں شائبہ نہ تھا۔ اسی لئے انھیں ایسے لوگوں کو دیکھ کر بے چینی ہوتی تھی "راج" کا کردار ان کے اسی جذبے کی تخلیق ہے۔ انھیں میرا بمبئی سے آنا پسند نہ تھا وہ چاہتے تھے کہ فلمستان وغیرہ سے کوئی تعلق ہو جائے اور مستقل قیام کی صورت نکل آئے لیکن اسلامیہ ہائی اسکول میں مدرس کی جگہ مجھے مل چکی تھی اس لئے وہاں ٹھہرنا ناممکن ہو گیا۔ وہ کہا کرتے تھے۔ دوست کس غیر شاعرانہ ماحول میں جا رہے ہو۔ میاں جی بن کر لونڈوں کے ساتھ ڈنڈے بازی کرنے میں کیا لطف آئے گا۔

روانگی کے وقت وہ بہت متاثر ہوئے۔ مجھ پر بھی غیر معمولی اثر تھا۔ ہم دونوں بڑی دیر تک بغلگیر رہے تھے۔ اور ایک دوسرے کے دل کی دھڑکن سن رہے تھے۔ وہ مجھ سے پانچ چھ سال بڑے تھے۔ لیکن وضع قطع ہم لوگوں کی کچھ ایسی ملتی جلتی تھی کہ وہ مجھے اپنا "ڈبل کیٹ" کہا کرتے تھے۔ کاش میں واقعی ان کا "ڈپلی کیٹ" ہوتا۔ انھیں کی طرح بول سکتا۔ انھیں کی طرح سوچ سکتا۔ انھیں کی طرح لکھ سکتا۔

ان کا انداز تحریر انفرادی حیثیت رکھتا تھا بہت سے لوگوں نے نقالی کرنی چاہی مگر کانٹوں سے تو الجھ کر رہ گئے پھولوں سے اپنا دامن نہ بھر سکے۔

منٹو البتہ یہ ہنر جانتے تھے۔ وہ دہکتے ہوئے شعلوں کو ہاتھ سے پکڑ لیتے تھے مگر کہیں خراش تک نہ آنے پاتی تھی۔ اکثر لوگوں کو ان کے اس کمال پر رشک ہوتا تھا۔ اور جب ان کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے تو جل بھن کر اوچھے ہتھیاروں سے وار کرنا شروع کر دیتے تھے۔

مگر وہ بڑے سخت جان تھے، ایسے واروں سے کبھی گھائل نہ ہوئے۔ "ٹھنڈا گوشت" کی اشاعت پر ہنگامہ مچ گیا۔ عدالت خفیفہ سے سزا ہو گئی۔ لیکن ہائی کورٹ کے فاضل جج نے انھیں بری کر دیا۔ اور جلنے والوں کو شکست فاش ہوئی۔

جب کچھ بس نہ چلا۔تو کچھ جلے دل کے پھپھولے توڑنے کے لئے چیخنے لگے کہ منٹو ترقی پسند نہیں ہے۔وہ جنسی بھول بھلیوں میں گم ہو گیا ہے۔اس نے ملک کو سڑا ہوا ادب دیا ہے جس کے تعفن سے سارا معاشرہ پراگندہ ہو رہا ہے۔

مگر اس کا ''نیا قانون'' ''ٹھنڈا گوشت'' ''سیاہ حاشیے'' اس الزام کا منہ توڑ جواب ہیں۔یہ دوسری بات ہے کہ سطحیت کے پرستار اپنی کور چشمی کے باعث فنکارانہ حسن کو نہ دیکھ سکیں۔اور اپنے اندھے پن کو چھپانے کے لئے اسی کو نابینا کہنے لگیں۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا اور بیں اور دوررس فنکار تھا۔اس نے صرف پانی پر اُبھرنے والے بلبلوں کو نہیں دیکھا بلکہ ہیت،اصلیت اور تخلیق کی وجہ دریافت کی ہے۔وہ عمل سے زیادہ عمل کے اسباب پر روشنی ڈالتا ہے۔اس کے کردار بھوکے ہیں۔روٹی کے۔جنس کے۔وہ ان کی بھوک کو پوشیدہ نہیں رکھتا۔بڑی بے باکی سے کھلم کھلا بیان کرتا ہے۔اس کی کہانیوں میں چالیس کردار انسانوں کا دل دھڑکتا ہے۔سماجی پیچ و خم کا صحیح نقشہ نظر آتا ہے۔اور آوارگی و فحاشی سے کہیں زیادہ اس نظام سے نفرت کا جذبہ ملتا ہے۔جو محبت کو سکوں سے تولتا ہے۔جو عصمت کی قیمت لگاتا ہے جو حوا کی نازک بیٹیوں کو طوائف بننے پر مجبور کر دیتا ہے۔

منٹو سو فیصدی ترقی پسند تھے۔اشترا کیت پر ان کا ایمان تھا۔مارکس کو قابل پرستش سمجھتے تھے۔لینن کی تصویر پر محبت کے پھول نچھاور کیا کرتے تھے۔مگر بچپن سے ایک پھیپھڑا کمزور تھا۔نحیف الجثہ تھے۔اتنی جان نہ تھی کہ خود بندوق کاندھے پر رکھ کر لڑنے مرنے کو نکل آتے۔لیکن ان کی چھوٹی موٹی کہانیاں کارتوس اور چھرے ہیں جو پسی ہوئی جنتا کی رائفلوں میں بھر کے عالیشان محلوں کو مسمار کر دینے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔انھوں نے بدنام۔ذلیل اور آوارہ طبقے کی بے حسی کو سمجھا تھا اور اس صدیوں کی کچلی ہوئی مخلوق کو جرأت۔خود اعتمادی اور مقابلہ کی طاقت بخشی۔

ان کا ایک پیام ہے۔گر کر بھی اپنے کو گرا ہوا نہ سمجھو۔جو تم پر کیچڑ اچھالتے ہیں،انھیں بے نقاب کر کے خود انھیں کا چہرا ان کو دکھا دو۔بدنامی اور ذلت سے تنگ آ کر اپنے میں احساس کمتری نہ پیدا کرو۔برائی کرنے والے برائیوں کے مجرم نہیں ہیں،بلکہ برائیوں کو تخلیق کرنے والا سماج اس جرم کا مرتکب ہے۔اور ایک نہ ایک دن اسے ضرور سزا ملے گی۔وہ اپنی موت آپ مر جائے گا۔اپنے کئے پر آپ پچھتائے گا اور جی بھر کے سزا پائے گا۔

انھیں مستقبل پر پورا بھروسہ تھا۔وہ عالم تصور میں آنے والے دور کا نقشہ بنایا کرتے تھے۔اداس چپ بیٹھے سوچ رہے ہیں۔صفیہ بھابی میز پر اکیلی تاش کھیل رہی ہیں اور وہ۔۔۔۔۔۔ صوفے پر ای کونے سے چپکے کسی دوسری دنیا کی سیر میں مشغول ہیں۔

توبہ ہے۔نہ ہنستے ہیں نہ بولتے ہیں۔آپ آدمی ہیں یا پتھر کی مورتی۔جی گھبرا گیا۔وہ محسوس کرتے کہ صفیہ بھابی زبان حال سے شکوہ کر رہی ہیں۔چونک پڑتے۔نیند سے بیدار ہو جاتے۔چلو صفیہ پکچر چلیں۔ذرا میرین ڈرائیو کی سیر کر آئیں،ہینگنگ گارڈن اور گیٹ وے آف انڈیا کا منظر دیکھ آئیں۔

کتنے اچھے ہیں میرے منٹو۔صفیہ بھابی دل ہی دل میں کہتیں۔سچ مچ بڑے اچھے تھے منٹو۔بیوی خوش۔ساس نازاں۔سالیاں مسرور۔احباب کو فخر۔صبح کو میز پر ناشتہ کے لئے بیٹھے اکیلے کھانے میں مزہ نہیں ملتا۔آغا خلش ہیں۔حیات امروہوی ہیں اور کبھی کبھی ہم بھی ہیں۔ایک ایک چیز کی تعریف کر رہے ہیں۔اپنی ماما بڑی بی کو داد دے رہے ہیں۔صفیہ کی توصیف کر رہے ہیں۔یہ پوریاں بڑی خستہ ہیں۔بالکل بسکٹ کا مزہ آرہا ہے۔انڈے بھی بے حد ذائقہ دے رہے ہیں۔توس پر مکھن بڑے سلیقہ سے لگا ہے۔گھر داری بھی مستقل ہنر ہے۔

اسٹیڈیو جانے کے لئے نکلتے تو دس بیس روپے جیب میں ڈال لیتے۔گھر سے اسٹیشن تک ٹفن پر آتے،ریلوے بک اسٹال سے کچھ انگریزی کے اخبارات وغیرہ خریدتے اور ملاڈ روانہ ہو جاتے۔شام کو عموماً جیب خالی کر کے گھر واپس آتے۔دوسروں کے کام آنا ضروری سمجھتے تھے۔مگر اس انداز سے معاونت کرتے تھے کہ داہنے ہاتھ کی بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہوتی تھی۔شاید صفیہ بھابی کو بھی یہ معلوم نہ ہوگا کہ وہ کس کے ساتھ کیا سلوک کرتے تھے۔

بزرگوں کی عزت کرنے میں کبھی کوتاہی نہ برتتے تھے۔عظیم آباد کے ایک معمر شاعر حضرت حکیم یاسؔ مدظلہ،برابر قدم رنجہ فرماتے تھے اور وہ کمال عقیدت سے پیش آتے تھے۔

مذہبی رسم و رواج کے تو پابند نہ تھے لیکن کہا کرتے تھے مذہب سے دامن چھڑانا اگر ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔شراب سے پرہیز نہ تھا ان کا خیال تھا کہ یہ وہ کسوٹی ہے جس پر اچھی بُری فطرت بڑی آسانی سے پرکھی جا سکتی ہے۔بہت کمسنی میں ذہن بالغ ہو گیا تھا اور صحافت کے میدان میں جولانی طبع کا مظاہرہ کرنے لگے تھے۔ہر قسم کے لوگوں سے مل چکے تھے۔اچھی بری صحبت کا پورا لطف اٹھا چکے تھے۔اور اڑتی چڑیا کی دم پہچان لیتے تھے۔لکھنے والوں کے نام کے آگے بی۔اے اور ایم اے دیکھ کر بہت ہنستے تھے۔کہتے تھے کہ یہ لوگ فنکارانہ استعداد کو حقیر سمجھتے ہیں جب ہی تو اپنی شخصیت کا رعب ڈالنے کے لئے ڈکشنری کے بے معنی الفاظ کا سہارا ڈھونڈتے ہیں۔

کچھ لوگ انھیں دیکھ کر تیوریاں چڑھا لیتے تھے مگر وہ مطلق خشمگیں نہ ہوتے تھے سمجھتے تھے یہ معصوم ہیں۔کھری کھری سننے سے گھبراتے ہیں۔

تقسیم ہند کے سلسلے میں ان کو لاہور بسانا پڑا۔حالات نے دماغ کو بڑا شدید جھٹکا دیا۔توازن برقرار نہ رہ سکا،پاگل ہو گئے۔علاج ہوا صحت علاج ہوا،پھر مرض نے حملہ کیا۔دوبارہ داخلہ لیا۔بظاہر تو ٹھیک ہو گئے لیکن اندرونی طور پر توانائی نہ آ سکی۔معمولی سی علالت نے جوڑ جوڑ ہلا دیا۔اسپتال پہنچائے گئے۔ہر طرح کی کوششیں ہوئیں مگر موت کے بے رحم ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی نہ پڑی۔خون کی قے ہوئی ساری فضا سنہری ہو گئی گرد و پیش میں لال لال ٹکڑے ناچنے لگے۔اور یہ سرخ سپاہی چاروں طرف سرخی پھیلاتا ہوا دنیا سے رخصت ہو گیا۔

ہر طرف سرعت کے ساتھ یہ خبر پھیل گئی۔بنارس میں میں نے بھی سنا۔منٹو ختم ہو گئے۔جب سے وہ لاہور گئے تھے مجھ سے خط و کتابت نہ رہی تھی۔اس میں کچھ تو میرے تساہل کو دخل تھا۔کچھ ان کی غفلت کو۔لیکن مجھے یہ یقین نہ تھا کہ وہ اتنی جلد ختم ہو جائیں گے۔ان کے ابھی جینے کے دن تھے۔صفیہ بھابی کو محبت شباب پر تھی۔احباب کا خلوص تابندہ تھا۔اور عوام الناس کی امیدیں وابستہ تھیں،انھوں نے سب سے ناتا توڑ لیا۔

مگر نہیں میں نے غلط کہا۔ان کا رشتہ کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ان کا پیغام زندہ ہے۔مجرموں کو بے نقاب کر دو۔چھپے ہوئے زخموں پر سے پھاہا نوچ لو۔سڑی گلی مخلوق کو بلند و بالا کر دو۔ان کے احباب بیدار ہیں۔ان کے پرستار جاگ چکے ہیں اور ان کی محبوب صفیہ منٹو زندہ ہیں۔وہ کبھی نہیں مر سکتے۔وہ کبھی نہیں ختم ہو سکتے۔

وہ آج بھی ہماری بزم میں موجود ہیں وہ آج بھی اپنی دہکتی ہوئی کہانیوں سے ہمارے ذہنوں کو گرما رہے ہیں وہ آج بھی سامنے کھڑے مسکرا رہے ہیں۔مخلص منٹو۔کامیاب منٹو۔شریر منٹو۔چیکھی باتیں کرنے والے۔جلی کٹی سنانے والے۔بے دھڑک نڈر اور منہ پھٹ۔ ●

نعیم کوثر

شمع لحد خاموش ہے

ہندوستان میں بعض وجوہ کی بناء پر جنس کا موضوع ایک پُر کیف خمار بن کر دل و دماغ پر چھایا جارہا ہے۔ برخلاف اس کے مغربی ممالک نے اس خمار کو ایک نفسیاتی آسیب میں تبدیل کردیا ہے۔ موجودہ ادبی دور میں ایسے کئی افسانہ نگار سامنے آئے ہیں۔ جنھوں نے مغرب کے اس رجحان سے یا فرائڈ کے نظریات سے متاثر ہوکر جنس کو اپنا شعار اور اپنے ادب کو عنوان بنالیا ہے۔ یہاں تک کہ اکثر جنسی تذکرہ ترقی پسندی کا ایک خاص عنصر سمجھا جاتا ہے۔ مگر اردو کے جنسی افسانہ نگاروں میں زیادہ تر ایسے ہیں جو آرٹ کی بخشی ہوئی پُر اثر اور رنگین آزادیوں سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ وہ لطف آفرینی اور لذتیت کو افسانے کا مقصد اولین سمجھتے ہیں۔ اسی طرح وہ لذت پرستی اور جذباتیت کا شکار ہوکر اردو ادب کے نازک بلوریں محل پر بھی چوٹ لگاتے ہیں۔ ایسے افسانہ نگار حقیقت میں منٹو کے فن سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ ان کی ناکام تقلید میں محض شہرت حاصل کرنے کا جذبہ کارفرما ہے اور "بدنام اگر ہوں گے تو تو کیا نام نہ ہوگا۔" پر شاید ایسے لوگوں کا ایمان ہے.................. اب تک بعض اردو رسالے صرف ایسے ہی افسانے شائع کرتے آرہے ہیں جو جنسی بھوک کو موضوع بنا کر ہیجانی ماحول پیدا کرتے ہیں۔ ایسی عریاں او فحش کہانیوں کی کتابیں بھی میں خوب بکتی ہیں۔ جنس کے موضوع سے کوئی تعمیری کام لینا ہمارے اکثر افسانہ نگار نہیں جانتے۔

اردو میں صرف سعادت حسن منٹو ایسے افسانہ نگار تھے جنھوں نے جنس کے ہر پہلو سے اس طرح بحث کی اور اس کی بے راہ روی کا نفسیاتی تجزیہ اس طرح کیا کہ اس کی تہہ میں جو سماجی حقیقتیں اور انسانی مقاصد تھے وہ اجاگر ہوگئے۔ انھوں نے انسانی ماحول کے ان شعلوں کو ابھارا ہے جو ماحول نے محض پردہ پوشی کے لئے یخ بستہ کردیئے تھے۔

جنسی مسائل کی نفسیاتی تحلیل و تشریح اور فائدے کے باریک نکات و نظریات سے منٹو کا دماغ اچھی اور مکمل واقفیت رکھتا تھا۔ انھوں نفسیات و جنسیات کی گہری جنبشوں کو فنکارانہ انداز سے اپنے افسانوں میں نہایت بیباکی کے ساتھ نمایاں کیا، حالانکہ مریضانہ ذہنیت رکھنے والے حضرات نے منٹو کے فن کو جنسی جذبات اور لذتیت کا نرا مجسمہ کہا ہے۔ مشہور ناول نگار عزیز احمد نے بھی اس فنکار پر کڑی تنقید کرتے ہوئے کہا تھا۔

"منٹو کے یہاں جنس کا طلسم ہے جو حد درجہ مریضانہ ہے۔" لیکن میرے خیال میں منٹو کا مقصد یہی تھا کہ مریض کا کامیاب آپریشن کافی کلوروفارم سونگھانے کے بعد ہی کیا جاسکتا ہے۔ ان کے افسانے لذت آمیز ہونے کے ساتھ ساتھ لطیف مذاق، گہرے طنز اور معنویت لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ 'پاگل' 'جنگ' اور 'ٹھنڈا گوشت' جیسے افسانے ان کی فنکاری کے بہترین نمونے ہیں۔

منٹو نے سماج کے گلے سڑے زخموں کو کرید کر انھیں ناسور بن جانے کا موقع نہیں دیا۔ بلکہ کہیں کہیں تو ان پر مرہم رکھ کر مندمل کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ جنسی مسائل کو سماج کے اجتماعی مسائل سے ٹکرا کر منٹو نے ایک نیا اسلوب پیدا کیا ہے۔ اگر وہ اعتدال کے ساتھ اجتماعی زندگی کی اصلاح و تعمیر کے لئے جنس کے ناگ کو چھیڑتے اور اس سے پاکیزہ سماجی مقاصد ابھارتے تو بلاشبہ وہ بغیر کسی نکتہ چینی و تنقید کے اردو ادب میں ایک بہت ہی عظیم حیثیت کے مالک ہوتے۔ میرے اس اظہار خیال کا مطلب کچھ الٹا بھی ہوسکتا ہے۔ میں منٹو کی عظیم حیثیت سے منکر نہیں ہوں۔ لیکن کچھ لغزشوں نے ضرور ان کے فن کو قاریوں کی آغوش میں لا ڈالا ہے۔ اور یہ لغزش وہی عریانی کی زیادتی ہے جو اتنے بڑے فنکار کی خوبیوں کے سامنے نظرانداز کی جاسکتی ہے اور نہیں بھی کی جاسکتی حالانکہ ابتدائی دور میں انھوں نے صرف سماجی حقائق کی تشریح تک ہی اپنے قلم کو جنس کے موضوع کی طرف موڑا تھا۔ نہایت شگفتگی اور برجستگی کے ساتھ۔

منٹو کا مقصد اپنے گندے سماج کو صحت مند بنانا تھا چنانچہ روٹی اور جنس پر جو ہندوستانی نا آسودہ سماج کی خاص پکار ہیں۔ انھوں نے لاتعداد افسانے لکھ ڈالے لیکن حیرت کا مقام یہ تھا کہ ان کا ہر افسانہ نئی تکنیک، اچھوتا تاثر، نیا اسلوب اور نیا جنسی میلان رکھتا تھا۔ شاید ان کا دماغ جنس کے ہر پہلو پر ہمیشہ نئے نئے زاویوں سے سوچنے اور انفرادی حیثیت کے مسائل اور گوشے ڈھونڈ نکالنے کے لئے تیار رہتا تھا۔

وہ عظیم فنکار حقیقت میں ہمارا مشیر تھا۔ معالج تھا۔ اس کا ہر افسانہ جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کہتا ہے کہ جنسی جذبات سے فرار اختیار نہ کرو ان کے تقاضوں کو مت جھٹلاؤ.................. اس میں شک نہیں کہ جنسی حقائق اپنی حدود سے آگے بڑھ کر کافی تباہ کن ہوسکتے ہیں۔ لیکن ان کی بے پناہ قوتوں کو صحت مندی کیساتھ سماج کے تعمیری مقاصد میں مددگار بنایا جاسکتا ہے۔ اور منٹو نے جنس سے دونوں ہی کام لئے۔ نہایت نزاکت، حسن، روانی اور فنکاری سے اگر انھوں نے پڑھنے والے کے جذبات میں ہیجان پیدا کیا تو یہ بھی ایک آرٹ ہے۔ ایک بلند، مشکل، اور غیر فانی نازک فن ---- جو جذبات میں ہیجان برپا کرنے کے باوجود جنس کے تلذذ کے لئے نہیں اکساتا۔ منٹو اپنے افسانے پڑھنے والوں کو جذباتی دنیا میں ڈبو کر ایک دم اوپر اچھال دیتے ہیں اور قاری اپنی نگاہوں کے سامنے ایسے خطوط کھینچے ہوئے پاتا ہے۔ جن کے دائروں میں سماج کے تاریک سائے چھپے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ انسانی لاشیں سسکتی اور سڑتی نظر آتی ہیں۔ اور پھر وہ اپنے افسانے کے آخری حصے میں ان تاریک سایوں کو روشنی میں لاتے ہیں۔

جو لوگ اس بلند اور بیباک فنکار کو بدنام، فحش اور عریاں نویس کہتے ہیں۔ انھوں نے کبھی غور کے ساتھ اس کے ان افسانوں کو نہیں پڑھا جو طنز کی گتھیوں کو افسانے کی رنگینی سے میں اس چالاکی سے گھول دیتے ہیں کہ قاری اسے محض کہانی سمجھ کر دماغ میں بسا لیتا ہے اور جب اس کا نشہ اس کے دل و دماغ میں تیزی سے سرایت کرجاتا ہے تو وہ غور کرتا ہے کہ خود اس کی زندگی میں ان گتھیوں کا کتنا حصہ ہے۔ اور کیا اس کے اپنے خاندان اور ماحول میں یہ تلخ واقعات ممکن نہیں۔ محض لذت پرستی اور جنسی ترغیبات کا پاٹ دے کر ان کے فن پر کیچڑ نہیں اچھالی جاسکتی۔ (باقی صفحہ ۴۹ پر دیکھئے)

ل۔ م۔ شاہد

سعادت حسن منٹو

میرا محبوب فنکار

"۱۰ر جنوری ۱۹۵۵ء کو سعادت حسن منٹو کی موت کی خبر جب مجھے ملی تو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میری کوئی محبوب چیز کھو گئی ہو...... اور میری آنکھوں میں پہلی بار کسی ادیب کے لئے آنسو آ گئے۔

پبلیشرز اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ ایڈیٹر رسائل کی ترتیب میں منہمک تھے۔ بار میں شراب کی بوتلیں کھنک رہی تھیں۔ فلمی دنیا میں فلموں کی شوٹنگ جاری تھی۔ ریڈیو آرٹسٹ گیت اور نغمے ترتیب دے رہے تھے۔ ہر طرف قہقہے گونج رہے تھے۔ ایسے میں منٹو مر گیا۔ اور اس کے مرنے پر کوئی نہیں چونکا۔ سبھی اپنے اپنے کاموں میں لگے رہے۔ ایک ادیب کی موت پر کام چھوڑ دیا جائے اور دوکانیں بند کردی جائیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ لیکن ایک لیڈر کی موت پر ایسا ہو سکتا ہے۔ اس لیڈر کی موت پر جو عوام کو کچل کر ایک محل کھڑا کرتا ہے۔ افسوس کہ منٹو لیڈر نہیں ایک ادیب تھا۔ اس کے ساتھ وہی ہوا جو ایک عرصے سے ہوتا چلا آیا ہے۔

آج منٹو ہمارے درمیان نہیں ہے۔ لیکن اس کی کہانیاں اس کے مضامین اور اس کے ڈرامے ہمیشہ رہیں گے۔ اس نے اردو ادب کو جو کچھ بھی دیا وہ کسی سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ جب وہ ادبی دنیا میں داخل ہوا تو وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ایک حقیقت تھی۔ ایک بے باکی تھی۔ ایک سچائی اور ایک زندگی تھی۔ میرا اپنا خیال ہے کہ جس ادیب کے قلم میں سچائی اور بے باکی نہ ہو اس کی تخلیقات کبھی زندہ نہیں رہ سکتیں۔

میں منٹو کا دوست نہیں ہوں۔ میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا اس سے کبھی باتیں نہیں کیں۔ میں نے اُسے کبھی کوئی خط نہیں لکھا۔ وہ بمبئی، لاہور اور دلی کی گلیوں اور سڑکوں پر گھومتا رہا اور میں رانچی اور جمشید پور کی سڑکوں پر بھٹکتا رہا۔ وہ فلمی کہانیاں لکھتا رہا میں صرف فلمیں دیکھتا رہا۔ وہ ریڈیو میں ڈرامے پیش کرتا رہا۔ اور میں چپ چاپ اس کے ڈراموں کو سنتا رہا۔ اس دوری کے باوجود مجھے یہ احساس رہا کہ منٹو میرے قریب ہے۔ بہت قریب اتنا قریب کہ میں اس سے باتیں کر سکتا ہوں اُسے چھو سکتا ہوں۔

جب منٹو کی کہانی "بو" ادب لطیف میں شائع ہوئی تو یہ "بو" صرف کاغذی صفحات تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ صفحات سے نکل کر نقادوں کی ناکوں تک پہنچی۔ نقاد جھلا اُٹھے اور منٹو فحش نگار قرار دے دیا گیا۔ لیکن منٹو نے اس کی قطعی پروا نہیں کی۔ وہ آگے بڑھتا گیا۔ اس کا قلم رُکا نہیں۔

بعض حضرات منٹو کے فحش افسانے چھپ کر پڑھتے ہیں۔ لیکن جب باہر آتے ہیں تو کہتے ہیں "منٹو بے کار چیزیں لکھتا ہے۔"

"منٹو فحش نگار ہے۔"

"منٹو آدمی نہیں ایک گندگی ہے۔"

"بو" چھپنے سے پہلے میں نے منٹو کا نام سُنا تھا۔ لیکن اُسے پڑھا نہیں تھا۔ ان دنوں میں رانچی اسکول میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ ایک دن میرے ایک ساتھی محمد اشرف نے بتایا کہ منٹو کی تازہ کہانی ادب لطیف میں آئی ہے۔ اسے ضرور پڑھو۔ میں نے بڑی مشکل سے رسالہ حاصل کیا۔ افسانہ کسی حد تک عریاں ضرور تھا لیکن منٹو کے کہنے کا جو مقصد تھا وہ فحش نہیں تھا۔

محمد اشرف (جو آج رانچی جی پی او میں کلرک ہے) کو منٹو کی کہانیاں اور ڈرامے بے حد عزیز ہیں۔ آج جب کہ منٹو مر چکا ہے اور جب سے مرنے کی خبر ملی ہو گی تو یقیناً وہ رو دیا ہو گا۔

چند حضرات کو افسوس ہے کہ منٹو نے کوئی ناول نہیں لکھا۔ اس کا افسوس مجھے بھی ہے لیکن پھر بھی ناول نہ لکھنے سے اس کی شہرت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرا تو خیال ہے کہ اس نے ناول نہیں لکھا تو اچھا ہی کیا۔ آج کرشن چندر نے اردو ادب میں جو ایک بلند مقام حاصل کیا ہے وہ ناول لکھ کر نہیں بلکہ کہانیاں لکھ کر کیا ہے۔

منٹو ترقی پسند تھا یا رجعت پسند؟ اس کا جواب بالکل آسان ہے۔ وہ ایک ترقی پسند فن کار ہے۔ اگر سچی باتیں کرنے والا ترقی پسند نہیں ہو سکتا تو منٹو بھی ترقی پسند نہیں تھا۔

اسے انجمن ترقی پسند مصنفین نے ۱۹۴۸ء میں رجعت پسندی کا الزام دیتے ہوئے نکال دیا تھا لیکن اس کے باوجود بھی وہ ترقی پسند پرچوں میں چھپتا رہا۔ وہ کیوں چھپتا رہا؟ اس کا جواب آج اردو ادب کے نقاد آپ کو دیں گے۔ وہ نقاد جو اس سے پہلے منٹو کو گالیاں دے چکے ہیں۔

منٹو نے اپنے افسانوں میں عورت کے اُس لباس کا ذکر کیا ہے جس کا دوسرا نام "عریانی" ہے۔ عریانی ایک حقیقت ہے۔ اس نے اس پردے کو اٹھایا جس پردے کے پیچھے ایک عرصے سے گناہ پرورش پا رہا ہے۔ اس نے سماج کی ان بیماریوں کو پیش کیا ہے جو صدیوں سے انسانی زندگی کو چاٹ رہی ہیں۔

منٹو مغربی ادب کے فن کاروں سے متاثر نہیں ہوا اُس نے کسی بڑے ادیب کی طرز تحریر کی نقل نہیں کی۔ کسی انگریزی افسانے کے پلاٹ کو توڑ مروڑ کر اردو میں پیش نہیں کیا۔ جیسا کہ آج بعض چوٹی کے افسانہ نگار بھی کبھی کرتے ہیں۔ سعادت حسن منٹو اپنے مضمون "منٹو اپنے ہمزاد کی نظر میں" لکھتا ہے۔

"منٹو ان پڑھ ہے۔ اس لحاظ سے کہ اس نے کبھی مارکس کا مطالعہ نہیں کیا۔ فرائڈ کی کوئی کتاب آج تک اس کی نظر سے نہیں گزری۔ ہیگل کا وہ صرف نام ہی جانتا ہے۔ ہیولک ایلس کو وہ صرف نام سے جانتا ہے لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ لوگ ...... میرا مطلب تنقید نگار، یہ کہتے ہیں کہ وہ ان تمام مفکروں سے متاثر ہے۔ جہاں تک میں جانتا ہوں منٹو کسی دوسرے کے خیال سے متاثر ہوتا ہی نہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ سمجھانے والے سب چغد ہیں۔ دنیا کو سمجھانا نہیں چاہیے۔ اس کو خود سمجھنا چاہیے۔"

کرشن چندر کا ایک مضمون ماہنامہ "شمع دہلی" کے زیر اہتمام شائع ہونے والے نئے ہفت روزہ "آئینہ" کے پہلے شمارے شائع ہوا ہے۔ وہ اس مضمون میں لکھتے ہیں۔

"منٹو ایک غریب ستائی ہوئی زبان کا غریب اور ستایا ہوا ادیب تھا۔ وہ موچیوں، طوائفوں اور تانگے والوں کا ادیب تھا۔"

محمد اسد اللہ اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

"منٹو نے لاہور کے اسکولوں میں لڑکوں سے قرض مانگا ہے۔ میں امتحان کی فیس جمع

کرنے جا رہا تھا۔ وہ روک کر بولے جیبوں کی تلاشی ہوگی۔ چالیس روپے نکل آئے۔ میں نے بار بار عرض کیا آج آخری تاریخ ہے اور فیس جمع کرنی لازم ہے۔ لیکن منٹو صاحب نے کہا۔ یار سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی مالی حالت اچھی نہیں رہی۔ اس سلسلے میں کرشن چندر اپنے مضمون میں لکھتے ہیں۔

"عبدالغنی دہلی کے ٹیلر ماسٹر نے منٹو کو گریبان سے پکڑ لیا تھا۔"

آزاد ہند۔ ۲۹ جنوری ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں لکھنؤ کے تعزیتی جلسے کی رپورٹ شائع ہوئی۔ بزم انیس نے شہر کے ممتاز اور مقتدر ادبا و شعراء کے تاثرات پیش کئے ہیں۔

"آج برنارڈ شاہ نے دوسری بار وفات پائی۔" (ڈاکٹر محمد حسن)

ڈاکٹر محمد حسن صاحب اردو کے مشہور و معروف نقاد ہیں۔ آپ نے منٹو کو برنارڈ شاہ کا خطاب دیا ہے جب کہ آج منٹو اس دنیا میں نہیں ہے۔ اگر یہ خطاب زندگی میں منٹو کو دیا جاتا ہے تو کوئی بات بھی پیدا ہوتی۔

"وہ بہت اہم افسانہ نگار تھا۔" (سید احتشام حسین)

"وہ اپنی انفرادیت رکھتا تھا۔ افسانہ کی تکنیک اور کردار نگاری پر اس کو عبور حاصل تھا۔ اردو ادب ایسے ادیب کو مدتوں روئے گا۔" (اسرار الحق مجاز)

"منٹو اپنے وقت کا عظیم کہانی کار ہے۔" (ظ انصاری)

"منٹو موجودہ سماج کا بدترین دشمن تھا۔ جس نے آخر میں اسے اپنا شکار بنالیا۔" (قیس ملیح راہبر)

"منٹو کی نظر اتنی گہری تھی کہ زندگی کے گھناؤنے حقائق کو پالیتی تھی۔ ان کی وفات سے جو نقصان بھارت اور پاکستان کے ادب کو پہنچا ہے وہ ناقابل تلافی ہے۔" (دیویندر ستیارتھی)

رسالہ نکہت الہ آباد کے فروری ۱۹۵۵ء کے شمارے میں ادارہ نکہت نے لکھا ہے۔

"منٹو نے انسانیت کا نعرہ نہیں لگایا۔"

گویا اس نے حیوانیت کا نعرہ لگایا۔ یہ کتنی عجیب سی بات ہے۔ حالانکہ اس نے انسانیت کی آواز کو عوام تک پہنچایا۔ انسانیت سے بے حد محبت تھی۔ اس نے انسانوں کے لئے کہانیاں لکھیں۔ اس کا ہر افسانہ انسانیت کا ایک نعرہ ہے۔

عادل رشید نے منٹو پر ایک مضمون "فلم آرٹ" میں لکھا ہے۔ اس مضمون میں عادل رشید نے منٹو کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ مضمون میں ہر جگہ اپنی شخصیت کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس مضمون سے پتہ چلتا ہے کہ منٹو ہمیشہ عادل رشید سے دب کر رہا۔ یہ کتنی حیرت، افسوس اور عبرت کی بات ہے۔

آج جب کہ منٹو زندہ نہیں ہے۔ ایسی حالت میں ہر شخص جوش میں آئے گا کہے گا۔

آج اردو ادب کی محفل سوگوار ہے۔ اس عوامی فن کار کے چلے جانے کے غم میں۔ جس کا نام سعادت حسن منٹو ہے۔ ●

بقیہ صفحہ ۲۶ شمع لحد خاموش ہے

وقت کے مطالبات کو سن کر یہ عظیم فن کار سماجی اور طبقاتی نشیب و فراز سے پیدا کردہ مسائل سے چشم پوشی نہیں کرتا۔ منٹو تو ان موضوعات کی آڑ لے کر سماج کی ننگی پیٹھ پر بے رحمی کے ساتھ تازیانے برساتے ہیں۔ اور ناقدان ادب صرف ان تازیانوں کی آواز سن کر انھیں ظالم کا نام دیدیتے ہیں۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ منٹو پڑھنے والے کو اس کے ذہنی تقاضے مہیا کرتے ہوئے انسانیت کے قوی اور دیو پیکر دشمنوں سے بھی جنگ کر رہا ہے۔ صرف ایک نازک موضوع کا ہتھیار لئے ہوئے۔

میری نظر میں ان کا ہر افسانہ ہماری معاشرت کے کسی نہ کسی پہلو پر دلچسپ انداز میں روشنی ڈالتا ہے۔ ان کے کردار مسکراہٹیں سسکیاں اور طوفان لئے ہوئے انسانی نفسیات سے بھرپور زندگی کی حقیقتوں سے دبیز پردے اٹھاتے ہیں۔ وہ حقائق جن کا اظہار اخلاقی اور سماجی اعتبار سے "گناہ" سمجھا جاتا ہے۔ منٹو نے اپنی تلخی اور اپنے طنز سے چھلکتے رنگین ساغر میں ان کا عکس لیا ہے۔

منٹو ایک بلند پایہ اور عظیم افسانہ نگار تھے۔ ان کی "ہتک" اور "بانجھ" کے مقابلہ میں اردو کے صرف چند ہی افسانے پیش کئے جاسکتے ہیں۔ فنکارانہ خیالات، اچھوتا اسلوب بیان، رنگینی و دلچسپی، بھرپور اشاریت سے مرصع ان کے افسانے ایک منفرد حیثیت کے مالک رہیں گے۔ ہمیشہ۔ "منٹو ایک ایسے کامیاب راہی تھے جس نے کامیابی، شہرت اور نظریات کی پختگی حاصل کر کے اپنی منزل کی خوشگوار وادی میں دم توڑ دیا۔ کوئی بھی نہیں کہہ سکتا۔ وہ ان راہوں سے بھٹک گئے۔ اپنے مصائب اور مشکلات میں وہ کبھی مایوس نہ ہوئے۔ اور نہ کسی سے مدد چاہی۔ وہ تو اپنے لازوال فن سے اپنی ذہنی اور دلی کوفت دور کرنے کے عادی تھے۔ اردو ادب سعادت حسن منٹو کے احسانات کے بار کو کبھی نہیں اتار سکتا۔ ان کے غیر فانی آرٹ کو دلوں سے دور نہیں کیا جاسکتا۔ آئندہ نسلیں ان کے فن کو چومیں گی۔ اور اس سے روشنی حاصل کریں گی۔

کس "صبح کے مشتاق کا ماتم ہے کہ فانی روتی ہے گلے مل کے سحر شمع لحد سے"

سعادت حسن منٹو

منٹو اپنے ہمزاد کی نظر میں

(انتقال سے چند ماہ پہلے منٹو نے یہ مضمون اپنے متعلق لکھا تھا)

منٹو کے متعلق اب تک بہت کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے اس کے حق میں کم اور خلاف زیادہ۔ یہ تحریریں اگر پیش نظر رکھی جائیں تو کوئی صاحب عقل منٹو کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم نہیں کرسکتا۔ میں یہ مضمون لکھنے بیٹھا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ منٹو کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرنا بڑا کٹھن کام ہے، لیکن ایک لحاظ سے آسان بھی ہے اس لئے کہ منٹو سے مجھے قربت کا شرف حاصل ہے۔ اور سچ پوچھئے تو منٹو کا میں ہمزاد ہوں۔

اب تک اس شخص کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں، لیکن میں اتنا سمجھتا ہوں کہ جو کچھ ان مضامین میں پیش کیا گیا ہے، حقیقت سے بالاتر ہے، بعض اسے شیطان کہتے ہیں، بعض گنجا فرشتہ۔۔ ذرا ٹھہریئے میں دیکھ لوں کہیں وہ کمبخت سن تو نہیں رہا۔ نہیں نہیں ٹھیک ہے، مجھے یاد آگیا کہ یہ وہ وقت ہے جب وہ پیا کرتا ہے اس کو شام کے چھ بجے کے بعد کڑوا شربت پینے کی عادت ہے۔ ہم اکٹھے ہی پیدا ہوئے اور خیال ہے کہ اکٹھے ہی مریں گے۔ لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ سعادت حسن مر جائے اور منٹو نہ مرے اور ہمیشہ مجھے یہ اندیشہ بہت دکھ دیتا ہے۔ اس لئے کہ میں نے اس کے ساتھ اپنی دوستی نبھانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اگر وہ زندہ رہا اور میں مر گیا تو ایسا ہوگا کہ انڈے کا خول تو سلامت ہے اور اس کے اندر کی زردی اور سفیدی غائب ہوگئی ہے۔

اب میں زیادہ تمہید میں جانا نہیں چاہتا۔ آپ سے صاف کہے دیتا ہوں کہ منٹو ایسا ون ٹو آدمی میں نے اپنی زندگی میں کہیں نہیں دیکھا۔ جسے اگر جمع کیا جائے تو وہ تین بن جائے، مثلث کے بارے میں اس کی معلومات کافی ہیں۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ ابھی اس کی تثلیث نہیں ہوئی، یہ اشارے ایسے ہیں جو صرف باہم سامعین ہی سمجھ سکتے ہیں۔

یوں تو منٹو کو میں اس کی پیدائش ہی سے جانتا ہوں، ہم دونوں اکٹھے ایک ہی وقت ۱۱/ مئی ۱۹۱۲ء کو پیدا ہوئے۔ لیکن اس نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ وہ خود کو کچھوا بنائے رکھے، جو ایک دفعہ اپنا سر اور گردن اندر چھپالے، تو آپ لاکھ ڈھونڈتے رہیں تو اس کا سراغ نہ ملے۔ لیکن میں بھی اس کا آخر ہمزاد ہوں۔ میں نے اس کی ہر جنبش کا مطالعہ کر ہی لیا۔

لیجئے میں اب آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ خرذات افسانہ نگار کیسے بنا۔ تنقید نگار بڑے لمبے چوڑے مضامین لکھتے ہیں، اپنی ہمہ دانی کا ثبوت دیتے ہیں۔ شوپن ہار، فرائڈ ہیگل، نٹشے، مارکس کے حوالے دیتے ہیں۔ مگر حقیقت سے کوسوں دور رہتے ہیں۔

منٹو کی افسانہ نگاری دو متضاد عناصر کے تصادم کا باعث ہے۔ اس کے والد خدا انہیں بخشے بڑے سخت گیر تھے اور اس کی والدہ بے حد نرم دل۔ ان دو پاٹوں کے اندر پس کر یہ دانۂ گندم کس شکل میں باہر نکلا ہوگا اس کا اندازہ آپ کر سکتے ہیں۔

اب میں اس کی اسکول کی زندگی کی طرف آتا ہوں۔ بہت ذہین لڑکا تھا، اور بے حد شریر۔ اس زمانے میں اس کا قد زیادہ سے زیادہ ساڑھے تین فٹ ہوگا وہ اپنے باپ کا آخری بچہ تھا، اس کو اپنے ماں باپ کی محبت تو میسر تھی، لیکن اس کے تین بڑے بھائی جو عمر میں اس سے بڑے تھے اور ولایت میں تعلیم پا رہے تھے ان سے اس کو ملاقات کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اس لئے کہ وہ سوتیلے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اس سے ملیں، اس سے بڑے بھائیوں ایسا سلوک کریں، یہ سلوک اسے اس وقت نصیب ہوا جب دنیائے ادب اسے بہت بڑا افسانہ نگار تسلیم کر چکی تھی۔

اچھا اب اس کی افسانہ نگاری کے متعلق سنیئے، وہ اول درجہ کا فراڈ ہے پہلا افسانہ اس نے بعنوان "تماشہ" لکھا جو جلیان والا باغ کے خونیں حادثہ سے متعلق تھا، یہ اس نے اپنے نام سے نہیں چھپوایا یہی وجہ ہے کہ وہ پولس کی دست بُرد سے بچ گیا۔

اس کے بعد اس کے متلون مزاج میں ایک لہر پیدا ہوئی کہ وہ مزید تعلیم حاصل کرے۔ یہاں اس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس نے انٹرنس کا امتحان دو بار فیل ہوکر پاس کیا تھا وہ بھی تھرڈ ڈویژن میں اور آپ کو یہ سنکر بھی حیرت ہوگی کہ وہ اردو کے پرچے میں ناکام رہا۔

اب لوگ کہتے ہیں کہ وہ اردو کا بہت بڑا ادیب ہے، اور میں یہ سنکر ہنستا ہوں اس لئے کہ اردو اب بھی اسے نہیں آتی وہ لفظوں کے پیچھے یوں بھاگتا ہے جیسے کوئی جال والا شکاری تتلیوں کے پیچھے، وہ اس کے ہاتھ نہیں آتیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تحریروں میں خوبصورت الفاظ کی کمی ہے، وہ لٹھ مار ہے، لیکن جتنے لٹھ اس کی گردن پر پڑے ہیں اس نے بڑی خوشی سے برداشت کئے ہیں۔

اس کی لٹھ بازی عام محاورے کے مطابق جاٹوں کی لٹھ بازی نہیں ہے، وہ بنوٹ اور پھکیت ہے وہ ایک ایسا انسان ہے جو صاف اور سیدھی سڑک پر نہیں چلتا۔ بلکہ تنے ہوئے رسّے پر چلتا ہے لوگ سمجھتے ہیں کہ اب گرا۔۔۔ لیکن وہ کم بخت آج تک کبھی نہیں گرا۔ شاید گر جائے اوندھے منہ۔۔۔ کہ پھر نہ اٹھے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ مرتے وقت وہ لوگوں سے کہے گا کہ میں اسی لئے گرا تھا کہ گراوٹ کی مایوسی ختم ہوجائے۔

میں اس سے بیشتر کہہ چکا ہوں کہ منٹو اول درجے کا فراڈ ہے، اس کا مزید ثبوت یہ ہے کہ وہ اکثر کہا کرتا ہے کہ وہ افسانہ نہیں سوچتا خود افسانہ اسے سوچتا ہے، یہ بھی ایک فراڈ ہے۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ جب اسے افسانہ لکھنا ہوتا ہے تو اس کی وہی حالت ہوتی ہے جب کسی مرغی کو انڈا دینا ہوتا ہے۔ لیکن وہ یہ انڈا کہیں چھپ کر نہیں دیتا، سب کے سامنے دیتا ہے، اس کے دوست یار بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس کی تین بچیاں شور مچا رہی ہوتی ہیں۔ اور وہ اپنی مخصوص کرسی پر اکڑوں بیٹھا انڈے دیئے جاتا ہے، جو بعد میں چوں چوں کرتے افسانے بن جاتے ہیں، اس کی بیوی اس سے بہت نالاں ہے۔ وہ اس سے اکثر کہا کرتی ہے کہ تم افسانہ نگاری چھوڑ دو۔ کوئی دکان کھول لو، لیکن منٹو کے دماغ میں جو دکان کھلی ہے، اس میں پنساری کے سامان سے کہیں زیادہ سامان موجود ہے۔ اس لئے وہ اکثر سوچا کرتا ہے، اگر میں نے کبھی کوئی اسٹور کھول لیا تو ایسا نہ ہو کہ وہ کولڈ اسٹوریج یعنی سرد خانہ بن جائے۔ جہاں اس کے تمام خیالات و افکار منجمد ہوجائیں۔

میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں، اور مجھے ڈر ہے کہ منٹو مجھ سے خفا ہو جائے گا۔ اس کی ہر چیز برداشت کی جا سکتی ہے، مگر خفگی برداشت نہیں کی جا سکتی۔ خفگی کے عالم میں وہ بالکل شیطان

بن جاتا ہے۔لیکن صرف چند منٹوں کے لئے اور وہ چند منٹ اللہ کی پناہ۔

افسانہ لکھنے کے معاملے میں وہ نخرے ضرور بگھارتا ہے، لیکن میں جانتا ہوں اس لئے ۔۔۔کہ اس کا ہمزاد ہوں۔کہ وہ فراڈ کر رہا ہے۔اس نے ایک دفعہ خود لکھا تھا کہ اس کی جیب میں بیشمار افسانے پڑے ہوئے ہیں۔حقیقت اس کے برعکس ہے۔جب اسے افسانہ لکھنا ہوگا، تو وہ رات کو سوچے گا۔اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔صبح پانچ بجے اٹھے گا۔اور اخباروں سے کسی افسانہ کا رس چوسنے کا خیال کریگا۔لیکن اسے ناکامی ہوگی۔پھر وہ غسل خانے میں جائے گا۔وہاں وہ اپنے شوریدہ سر کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرے گا۔کہ وہ سوچنے کے قابل ہو سکے۔لیکن ناکام رہے گا۔پھر جھنجھلا کر اپنی بیوی سے خواہ مخواہ کا جھگڑا شروع کردے گا۔یہاں سے بھی ناکامی ہوگی۔تو باہر پان لینے کے لئے چلا جائے گا۔پان اس کی ٹیبل پر پڑا رہے گا۔لیکن افسانے کا موضوع اس کی سمجھ میں پھر بھی نہیں آئے گا۔آخر وہ انتقامی طور پر قلم یا پنسل ہاتھ میں لے گا۔اور ۸۶ے لکھ کر جو پہلا فقرہ اس کے ذہن میں آئے گا اس سے افسانے کا آغاز کردے گا۔

بابو گوپی ناتھ، ٹوبہ ٹیک سنگھ، ہتک، ممی۔موذیل، یہ سب افسانے اس نے اسی فراڈ طریقے سے لکھے ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ لوگ اسے بڑا غیر مذہبی اور فحش انسان سمجھتے ہیں۔اور میرا بھی خیال ہے کہ وہ کسی حد تک اس درجہ میں آتا ہے۔ اس لئے کہ اکثر اوقات وہ بڑے گہرے موضوعات پر قلم اٹھاتا ہے۔اور ایسے الفاظ اپنی تحریر میں استعمال کرتا ہے۔جن پر اعتراض کی گنجائش بھی ہو سکتی ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ جب بھی اس نے کوئی مضمون لکھا، پہلے صفحے کی پیشانی پر ۸۶ے ضرور لکھا جس کا مطلب ہے بسم اللہ۔۔اور یہ شخص جو اکثر خدا سے منکر نظر آتا ہے، کاغذ پر مومن بن جاتا ہے۔یہ وہ کاغذی منٹو ہے جسے آپ کاغذی باداموں کی طرح صرف انگلیوں ہی میں توڑ سکتے ہیں۔ورنہ لوہے کے ہتھوڑے سے بھی ٹوٹنے والا آدمی نہیں۔

اب میں منٹو کی شخصیت کی طرف آتا ہوں۔جو چند القاب میں بیان کئے دیتا ہوں۔وہ چور ہے۔۔۔جھوٹا ہے۔۔دغاباز ہے اور مجمع گیر ہے۔

اس نے اکثر اپنی بیوی کی غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کئی کئی سو روپے اڑائے ہیں۔ادھر آٹھ سو لا کے دیئے اور چور آنکھ سے دیکھتا رہا کہ اس نے کہاں رکھے ہیں۔اور دوسرے دن اس میں سے ایک سبزہ غائب کردیا۔اور اس بیچاری کو جب اپنے اس نقصان کی خبر ہوئی تو اس نے نوکروں کو ڈانٹنا ڈپٹنا شروع کردیا۔

یوں تو منٹو کے متعلق مشہور ہے کہ وہ راست گو ہے لیکن میں اس سے اتفاق کرنے کے لئے تیار نہیں، وہ اول درجے کا جھوٹا ہے، شروع شروع اس کا جھوٹ اس کے گھر چل جاتا تھا۔اس لئے کہ اس میں منٹو کا ایک خاص ٹچ ہوتا تھا۔لیکن بعد میں اس کی بیوی کو معلوم ہوگیا کہ اب تک مجھ سے خاص معاملے کے مطابق جو کچھ کہا جاتا تھا۔جھوٹ تھا۔

منٹو جھوٹ بقدر کفایت بولتا ہے۔لیکن اس کے گھر والے مصیبت ہے کہ اب یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اس کی ہر بات جھوٹی ہے۔اس تل کی طرح جو کسی عورت نے اپنے گال پر سرمے سے بنا رکھا ہو۔

وہ ان پڑھ ہے اس لحاظ سے اس نے کبھی مارکس کا مطالعہ نہیں کیا فرائڈ کی کوئی کتاب آج تک اس کی نظر سے نہیں گزری۔ہیگل کا وہ صرف نام ہی جانتا ہے ہیولک ایلس کو وہ صرف نام سے جانتا ہے۔لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ لوگ۔۔۔۔۔۔میرا مطلب ہے تنقید نگار یہ کہتے ہیں کہ وہ ان تمام مفکروں سے متاثر ہے جہاں تک میں جانتا ہوں، منٹو کسی دوسرے شخص کے خیال سے متاثر ہوتا ہی نہیں۔وہ سمجھتا ہے کہ سمجھانے والے سب چغد ہیں۔دنیا کو سمجھانا نہیں چاہیے اس کو خود سمجھنا چاہیے۔ ●

سعادت حسن منٹو

افسانہ نگار اور جنسی مسائل

کوئی حقیر سے حقیر چیز ہی کیوں نہ ہو، مسائل پیدا کرنے کا باعث ہو سکتی ہے۔ مسہری کے اندر ایک مچھر گھس آئے تو اس کو باہر نکالنے، مارنے اور آئندہ کے لئے دوسرے مچھروں کی روک تھام کرنے کے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ یعنی تمام مسئلوں کا باپ اس وقت پیدا ہوا تھا۔ جب آدم نے بھوک محسوس کی تھی۔ اور اس سے چھوٹا مگر دلچسپ مسئلہ اسوقت پردہ ظہور میں آیا تھا جب دنیا کے اس سب سے پہلے مرد کی دنیا کی سب سے پہلی عورت سے ملاقات ہوئی تھی۔

یہ دونوں مسئلے جیسا کہ آپ جانتے ہیں، دو مختلف قسم کی بھوکیں ہیں جن کا آپس میں بہت گہرا تعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں اس وقت جتنے معاشرتی، مجلسی، سیاسی اور جنگی مسائل نظر آتے ہیں ان کے عقب میں یہی دو بھوکیں جلوہ گر ہیں۔

موجودہ جنگ کا خونیں پردہ اگر اٹھا دیا جائے تو لاشوں کے انبار کے پیچھے آپ کو ملک گیری کی بھوک کے سوا اور کچھ نظر نہیں آئے گا۔

بھوک کسی قسم کی بھی ہو بہت خطرناک ہے۔ آزادی کے بھوکوں کو اگر غلامی کی زنجیریں ہی پیش کی جاتی ہیں تو انقلاب ضرور برپا ہوگا۔ روٹی کے بھوکے اگر فاقے ہی کھینچتے رہے تو وہ تنگ آکر دوسرے کے کا نوالہ ضرور چھینیں گے۔ مرد کی نظروں کو اگر عورت کے دیدار کا بھوکا رکھا گیا تو شاید وہ اپنے ہم جنسوں اور حیوانوں ہی میں اس کا عکس دیکھنے کی کوشش کریں۔

دنیا میں جتنی لعنتیں ہیں بھوک ان کی ماں ہے۔ بھوک گداگری سکھاتی ہے۔ بھوک جرائم کی ترغیب دیتی ہے، بھوک عصمت فروشی پر مجبور کرتی ہے، بھوک انتہا پسندی کا سبق دیتی ہے۔ اس کا حملہ بہت شدید، اس کا وار بہت اوچھا اور اس کا زخم بہت گہرا ہوتا ہے۔ بھوک دیوانے پیدا کرتی ہے دیوانگی بھوک پیدا نہیں کرتی۔

دنیا کے کسی کونے کا مصنف ہو، ترقی پسند ہو یا تنزل پسند، بوڑھا ہو یا جوان، اس کے سامنے دنیا کے تمام بکھرے ہوئے مسائل رہتے ہیں، چن چن کر وہ ان پر لکھتا رہتا ہے، کبھی کسی کے حق میں اور کبھی کسی کے خلاف۔

آج کا ادیب بنیادی طور پر آج سے پانچ سو سال پہلے کے ادیب سے کوئی زیادہ مختلف نہیں۔ ہر چیز پر نئے اور پرانے کا لیبل وقت لگاتا ہے انسان نہیں لگاتا۔ ہم آج نئے ادیب کہلاتے ہیں آنے والی کل ہمیں پرانا کر کے الماریوں میں بند کر دیگی، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم بیکار رہے ہم نے مفت میں دردسری کی۔ گھڑی کی سوئی جب ایک سے زر کر دو کی طرف رینگتی ہے تو ایک کا ہندسہ بے معرف نہیں ہو جاتا۔ پورا سفر طے کرکے سوئی پھر اسی ہندسے کی طرف لوٹتی ہے۔ یہ گھڑی کا اصول بھی ہے اور دنیا کا بھی۔

آج کے نئے مسائل بھی گزری ہوئی کل کے پرانے مسائل سے بنیادی طور پر مختلف نہیں۔ جو آج کی برائیوں میں گزری ہوئی کل ہی نے ان کے بیج بوئے تھے۔

جنسی مسائل جس طرح آج کے نئے ادیبوں کے پیش نظر ہیں اسی طرح پرانے ادیبوں کے پیش نظر بھی تھے۔ انھوں نے ان پر اپنے رنگ میں لکھا، ہم آج اپنے رنگ میں لکھ رہے ہیں۔

مجھے معلوم نہیں۔ مجھ سے جنسی مسائل کے متعلق بار بار کیوں پوچھا جاتا ہے؟ شاید اس لئے کہ لوگ مجھے ترقی پسند کہتے ہیں۔ یا شائد اس لئے کہ میرے چند افسانے جنسی مسائل سے متعلق ہیں۔ یا پھر اس لئے کہ آج کے نئے ادیبوں کو بعض حضرات جنس زدہ قرار دے کر انھیں ادب، مذہب، اور سماج سے یک قلم خارج کر دینا چاہتے ہیں۔ وجہ کچھ بھی ہو میں آج اپنا نقطۂ نظر بیان کئے دیتا ہوں۔

روٹی اور پیٹ، عورت اور مرد یہ دو بہت پرانے رشتے ہیں ازلی اور ابدی۔ روٹی زیادہ اہم ہے یا پیٹ۔ عورت زیادہ ضروری ہے کہ مرد۔ اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا اس لئے کہ میرا پیٹ روٹی مانگتا ہے، لیکن مجھے یہ نہیں معلوم کہ گیہوں بھی میرے پیٹ کے لئے اتنا ہی ترستا ہے جتنا کہ میرا پیٹ؟

پھر بھی جب میں سوچتا ہوں کہ زمین نے گیہوں کے خوشوں کو بے کار جنم نہیں دیا ہوگا، تو مجھے خوش فہمی ہوتی ہے کہ میرے پیٹ ہی کے لئے وسیع و عریض کھیتوں میں سنہری بالیاں جھومتی ہیں اور پھر ہو سکتا ہے کہ میرا پیٹ پہلے پیدا ہوا ہو اور گیہوں کی یہ بالیاں کچھ دیر بعد۔

کچھ بھی ہو لیکن یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ دنیا کا ادب صرف ان دو رشتوں ہی سے متعلق ہے۔ الہامی کتابیں بھی جن کو آسمانی ادب کہنا چاہیے، روٹی اور پیٹ، عورت اور مرد کے تذکروں سے خالی نہیں۔

مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ مسائل اتنے پرانے ہیں کہ ان کا ذکر الہامی کتابوں میں بھی آچکا ہے تو پھر کیوں آج کے ادیب ان پر خامہ فرسائی کرتے ہیں۔ کیوں عورت اور مرد کے تعلقات کو بار بار کریدا جاتا ہے اور بقول شخصے عریانی پھیلائی جاتی ہے جواب اس سوال کا یہ ہے کہ اگر ایک ہی بار جھوٹ نہ بولنے اور چوری نہ کرنے کی تلقین پر ساری دنیا جھوٹ اور چوری سے پرہیز کرتی تو شاید ایک پیغمبر کافی ہوتا لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں پیغمبروں کی فہرست خاصی لمبی ہے۔

ہم لکھنے والے پیغمبر نہیں ہم ایک ہی چیز کو ایک ہی مسئلے کو مختلف حالات میں مختلف زاویوں سے دیکھتے ہیں اور جو کچھ ہماری سمجھ میں آتا ہے دنیا کے سامنے پیش کر دیتے ہیں اور کبھی مجبور نہیں کرتے وہ اسے قبول ہی کر سکیں۔

ہم قانون ساز نہیں، محتسب بھی نہیں۔ احتساب اور قانون سازی دوسروں کا کام ہے۔ ہم حکومتوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں لیکن خود حاکم نہیں بنتے، ہم عمارتوں کے نقشے بناتے ہیں لیکن معمار نہیں۔ ہم مرض بتاتے ہیں لیکن دواخانوں کے مہتمم نہیں۔

ہم جنسیات پر نہیں لکھتے جو سمجھتے ہیں کہ ہم ایسا کرتے ہیں، یہ ان کی غلطی ہے۔ ہم اپنے افسانوں میں خاص عورتوں اور خاص مردوں کے جنسی حالات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ہمارے کسی افسانے کی ہیروئن سے اس کا مرد اگر صرف اس لئے متنفر ہو جاتا ہے کہ وہ سفید کپڑے پسند کرتی ہے اور سادگی پسند ہے تو دوسری عورتوں کو اسے اصول نہیں سمجھ لینا چاہیے۔ یہ نفرت

کیوں پیدا ہوئی اور کن حالات میں پیدا ہوئی۔ اس استفہام کا جواب آپ کو ہمارے افسانے میں ضرور مل جائے گا۔

جو لوگ ہمارے افسانوں میں لذت حاصل کرنے کے طریقے دیکھنا چاہتے ہیں، انھیں یقیناً ناامیدی ہوگی۔ ہم داؤ پیچ بتانے والے خلیفے نہیں ہم جب اکھاڑے میں کسی کو گرتا دیکھتے ہیں تو اپنی سمجھ کے مطابق آپ کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہ وہ کیوں گرا تھا۔

ہم رجائی ہیں دنیا کی سیاہیوں میں بھی ہم اجالے کی لکیریں دیکھ لیتے ہیں ہم کسی کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ چکلوں میں جب کوئی تخیائی اپنے کوٹھے پر سے کسی راہ گزر پر پان کی پیک تھوکتی ہے تو ہم دوسرے تماشائیوں کی طرح نہ تو کبھی اس رہگذر پر ہنستے ہیں اور نہ کبھی اس تخیائی کو گالیاں دیتے ہیں۔ ہم یہ واقعہ دیکھ کر رک جائیں گے۔ ہماری نگاہیں اس غلیظ پیشہ ور عورت کے نیم عریاں لباس کو چیرتی ہوئی اس کے سیاہ عصیاں بھرے جسم کے اندر داخل ہو کر اس کے دل تک پہنچ جائیں گی۔ اس کو ٹٹولیں گی اور ٹٹولتے ٹٹولتے ہم خود کچھ عرصے کے لیے تصور میں وہی کریہہ اور متعفن زندگی بن جائیں گے۔ صرف اس لئے کہ ہم اس واقعہ کی تصویر ہی نہیں بلکہ اس کے اصل محرک کی وجہ بھی پیش کر سکیں۔

جب ہم کسی ویشیا کو دیکھتے ہیں تو اس کی ہستی سے عورت کو نوچ کر علاحدہ نہیں کر دیتے۔ ہم بادلوں کے اندر سے دیکھنے کے عادی ہیں۔

جب کسی اچھے خاندان کی جوان، صحت مند اور خوبصورت لڑکی کسی مریل، بدصورت اور قلاش لڑکے کے ساتھ بھاگ جاتی ہے تو ہم اسے ملعون قرار نہیں دیں گے، دوسرے اس لڑکی کا ماضی، حال، اور مستقبل اخلاق کی پھانسی میں لٹکا دیں گے لیکن ہم وہ چھوٹی سی گرہ کھولنے کی کوشش کریں گے۔ جس نے اس لڑکی کے ادراک کو بے حس کیا۔

انسان ایک دوسرے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں، جو غلطی ایک مرد کرتا ہے دوسرا بھی کر سکتا ہے۔ جب ایک عورت بازار میں دکان لگا کر اپنا جسم بیچ سکتی ہے تو دنیا کی سب عورتیں ایسا کر سکتی ہیں، لیکن غلط کار انسان نہیں وہ حالات ہیں جن کی کھیتیوں میں انسان اپنی غلطیاں پیدا کرتا ہے اور ان کی فصلیں کاٹتا ہے۔

زیادہ تر جنسی مسائل ہی آج کے نئے ادیبوں کی توجہ کا مرکز کیوں بنے ہوئے ہیں اس کا جواب معلوم کرنا کوئی زیادہ مشکل نہیں۔ یہ زمانہ عجیب و غریب قسم کے اضداد کا زمانہ ہے،

عورت قریب بھی ہے اور دور بھی کہیں مادر زاد برہنگی نظر آتی ہے، کہیں سر سے لے کر پیر تک کہیں عورت مرد کے بھیس میں دکھائی دیتی ہے، کہیں مرد عورت کے بھیس میں۔

دنیا ایک بہت بڑی کروٹ لے رہی ہے، ہندوستان بھی جہاں آزادی کا ننھا سا بچہ غلامی کے دامن سے اپنے آنسو پونچھ رہا ہے، مٹی کا نیا گھروندا بنانے کے لئے ضد کر رہا ہے۔ مشرقی تہذیب کے چولی کے بند بھی کھولے جاتے ہیں، کبھی باندھے جاتے ہیں۔ مغربی تہذیب کا غازہ بھی ملتا جاتا ہے، کبھی لگایا جاتا ہے ایک افراتفری سی مچی ہے۔ نئے کھٹ نئے پرانے کھاتوں کی موج اُدھیڑ رہے ہیں، پرانے کھٹ بے چلا رہے ہیں، ملی ہوئی چالوں سے کہیں کھل نکل رہے ہیں، کہیں یہ تو۔ کوئی کہتا ہے انھیں زندہ رہنے دو، کوئی کہتا ہے نہیں فنا کر دو، اس دھاندلی میں، اس شورش میں ہم نئے لکھنے والے اپنے قلم سنبھالے کبھی اس مسئلے سے ٹکراتے ہیں کبھی اس مسئلے سے۔

اگر ہماری تحریروں میں عورت اور مرد کے تعلقات کا ذکر آپ کو زیادہ نظر آتا ہے تو یہ ایک فطری بات ہے، ملک، ملک سے سیاسی طور پر جدا کئے جا سکتے ہیں۔ ایک مذہب دوسرے مذہب سے عقیدوں کی بنا پر علاحدہ کیا جا سکتا ہے اور زمینوں کو ایک قانون ایک دوسرے سے بیگانہ کر سکتا ہے، لیکن کوئی سیاست، کوئی عقیدہ، کوئی قانون، عورت اور مرد کو ایک دوسرے سے دور نہیں کر سکتا۔

عورت اور مرد میں جو فاصلہ ہے اس کو عبور کرنے کی کوشش ہر زمانے میں ہوتی رہے گی، عورت اور مرد میں جو ایک لرزتی ہوئی دیوار حائل ہے، اسے سنبھالنے اور گرانے کی سعی ہر صدی، ہر قرن میں ہوتی رہے گی۔ جو اسے عریانی سمجھتے ہیں، انھیں اپنے احساس کے تنگ پر افسوس ہونا چاہیے، جو اسے اخلاق کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں، انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اخلاق زنگ ہے۔ جو سماج کے استرے پر بے احتیاطی سے جم گیا ہے۔

جو سمجھتے ہیں کہ نئے ادب نے جنسی مسائل پیدا کئے ہیں، غلطی پر ہیں، کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ جنسی مسائل نے اس نئے ادب کو پیدا کیا ہے، اس نئے ادب کو جس میں آپ کبھی کبھی اپنا ہی عکس دیکھتے ہیں اور جھنجھلا اٹھتے ہیں۔ حقیقت خواہ شکر ہی میں لپیٹ کر پیش کی جائے، اس کی کرکڑواہٹ دور نہیں ہوگی، ہماری تحریریں آپ کو کڑوی اور کسیلی لگتی ہیں۔ مگر اب تک جو مٹھاس آپ کو پیش کی جاتی رہی ہے اس سے انسانیت کو کیا فائدہ ہوا ہے، نیم کے پتے کڑوے سہی مگر خون ضرور صاف کرتے ہیں۔ ●

بقیہ صفحہ ۳۳ منٹو اور حقیقت نگاری میں زاویۂ نگاہ

امریکی کہانیوں کی جو ایک خصوصیت ہے اسے منٹو کا اصول سمجھنا غلط ہے۔ منٹو نے اس کیفیت کے ساتھ بڑے دلچسپ افسانے لکھے ہیں ان کو افسانہ کی تکنیک پر عبور حاصل ہے۔ موضوع کے انتخاب میں محنت ضرور کرتے ہیں۔ لیکن اپنے شعور کی ساری روشنی میں اس انتخاب پر پھیلا نہیں پاتے، اس لئے تنوع تو پیدا ہوتا ہے لیکن اس تنوع میں بعض وقت صحیح نقطۂ نگاہ اور اچھی نظر کی کمی کی وجہ سے وسعت اور گہرائی پیدا نہیں ہوتی، منٹو کردار نگاری اور پس منظر کی طرف بہت زیادہ دھیان دیتے ہیں لیکن ان کی نئی کہانیوں میں یہ دونوں عناصر کمزور نظر آتے ہیں جب وہ اپنے افسانوں سے صرف ہیجان پیدا کرنا چاہتے ہیں اس وقت کردار نگاری اور پس منظر دو عناصر ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ اور تکنیک کو صدمہ پہنچتا ہے۔ "سرکنڈوں کے پیچھے" "بابو گوپی ناتھ" "بڑی لڑکی" "دھواں" اور "پری" جیسی کہانیاں مثال کے لئے پیش کی جا سکتی ہیں۔

منٹو جنس یا طوائف کے خاص ماحول کی حقیقتوں کی زہرناکیوں سے اچھی طرح واقف تھے یہی وجہ ہے کہ اس خاص ماحول کی سب سے اچھی کہانیاں منٹو نے لکھی ہیں ان کا شعور ایک زخمی شعور ہے، یہی وجہ ہے کہ جنس یا طوائف کی باتوں پر لکھتے ہوئے ان کے قلم میں بلا کی تیزی آجاتی ہے اور تکنیک کے عناصر وہ ساری چیزیں حاصل کر لیتے ہیں جن چیزوں کی تکنیک کو ضرورت ہوتی ہے منٹو اس ماحول کے لئے ڈوب جاتے ہیں، اپنے زخمی شعور کیساتھ ان کھنڈروں میں جنھیں ہم نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ منٹو کی فحش نگاری بہت آگے بڑھ گئی اور ہم فحش نگاری وہیں تک برداشت کر سکتے ہیں جہاں تک اخلاقی قدروں کی شکستگی اور عریانی کی گرم بازاری رکی ہوئی ہے۔ منٹو کی کہانیوں میں کسی خاص ارتقا کا قانون کام نہیں کرتا رہا ہے، منٹو زندگی کی حرکت اس کی بدلی ہوئی تنظیم و ترتیب، اس کے نت نئے تعلقات اور اضافی روابط کی طرف سے بے پرواہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کا وسیع مطالعہ بھی ان کے فن میں شامل ہوا اور گہرائیاں بھی اچھی طرح پیدا ہوئیں۔ متحرک زندگی پر چڑھتی ہوئی تہوں اور ان تہوں کی پیچیدگی کے متعلق ہر ادیب کو کچھ سوچنا پڑتا ہے، ہمارے ذہن اور شعور کو ادبی تخلیق سے فائدہ پہنچانا بھی ضروری ہے۔ منٹو نے شعوری طور پر اس کی کوئی کوشش نہیں کی۔ منٹو کے فن سے قابل اعتراض عناصر کو ہٹا کر ہمیں بہت ساری چیزیں ایسی ملیں گی جن کی ہمیں قدر کرنی چاہیے۔ اور اس سرمایے سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ منٹو کے ساتھ ایک کائنات سمٹ گئی ہے۔ اس لئے کہ ایک جادوگر مر گیا اس کی جادوگری کے تماشے اپنی گہرائیوں، بلندیوں، اپنی صحت اور اپنی کیفیات کے لحاظ سے یکتا اور لاثانی ہے نئی نسلوں کو منٹو کی اداؤں سے بہت کچھ سیکھنا ہے منٹو کی غلطیوں سے بھی اور ان کی پیچیدگیوں اور نیرنگ سامانیوں سے بھی۔ ●

سعادت حسن منٹو

ٹوبہ ٹیک سنگھ

بٹوارے کے دو تین سال بعد پاکستان اور ہندستان کی حکومتوں کو خیال آیا کہ اخلاقی قیدیوں کی طرح پاگلوں کا تبادلہ بھی ہونا چاہیے یعنی جو مسلمان پاگل، ہندستان کے پاگل خانوں میں ہیں انھیں پاکستان پہنچا دیا جائے اور جو ہندو اور سکھ پاکستان کے پاگل خانوں میں ہیں انھیں ہندستان کے حوالہ کر دیا جائے۔

معلوم نہیں یہ بات معقول تھی یا غیر معقول، بہر حال دانش مندوں کے فیصلے کے مطابق اِدھر اُدھر اونچی سطح کی کانفرنسیں ہوئیں اور بالآخر ایک دن پاگلوں کے تبادلہ کے لئے مقرر ہو گیا، اچھی طرح چھان بین کی گئی۔ وہ مسلمان پاگل جن کے لواحقین ہندستان ہی میں تھے، وہیں رہنے دیئے گئے تھے، جو باقی تھے ان کو سرحد پر روانہ کر دیا گیا۔ یہاں پاکستان میں چونکہ قریب قریب تمام ہندو سکھ جا چکے تھے۔ اس لئے کسی کو رکھنے رکھانے کا سوال ہی نہ پیدا ہوا۔ جتنے ہندو سکھ پاگل تھے سب کے سب پولس کی حفاظت میں بورڈر پر پہنچا دیئے گئے تھے۔

اُدھر کا حال معلوم نہیں۔ لیکن اِدھر لاہور کے پاگل خانے میں جب اس تبادلے کی خبر پہنچی تو بڑی دلچسپ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ایک مسلمان پاگل جو بارہ برس سے ہر روز باقاعدگی کے ساتھ "زمیندار" پڑھتا تھا، اُس نے جب اس کے ایک دوست نے پوچھا "مولبی ساب، یہ پاکستان کیا ہوتا ہے؟" تو اس نے بڑے غور و فکر کے بعد جواب دیا "ہندستان میں ایک ایسی جگہ ہے جہاں اُسترے بنتے ہیں۔"

یہ جواب سن کر اس کا دوست مطمئن ہو گیا۔

اسی طرح ایک سکھ پاگل نے ایک دوسرے سکھ پاگل سے پوچھا "سردار جی، ہمیں ہندوستان کیوں بھیجا جا رہا ہے۔ ہمیں تو وہاں کی بولی نہیں آتی۔"

دوسرا مسکرایا "مجھے تو ہندوستوڑوں کی بولی آتی ہے --- ہندستانی بڑے شیطانی اکڑ اکڑ پھرتے ہیں۔"

ایک دن نہاتے نہاتے ایک مسلمان پاگل نے "پاکستان زندہ باد" کا نعرہ اس زور سے بلند کیا کہ فرش پر پھسل کر گرا اور بیہوش ہو گیا۔

بعض پاگل ایسے بھی تھے جو پاگل نہیں تھے۔ ان میں اکثریت ایسے قاتلوں کی تھی جن کے رشتہ داروں نے افسروں کو دے دلا کر پاگل خانے میں بھجوا دیا تھا کہ پھانسی کے پھندے سے بچ جائیں۔ یہ کچھ کچھ سمجھتے تھے کہ ہندستان کیوں تقسیم ہوا ہے۔ اور یہ پاکستان کیا ہے۔ لیکن صحیح واقعات سے وہ بھی بے خبر تھے۔ اخباروں سے کچھ پتہ نہیں چلتا تھا اور پہرہ دار سپاہی ان پڑھ اور جاہل تھے۔ ان کی گفتگو سے بھی وہ کوئی نتیجہ برآمد نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو صرف اتنا معلوم تھا کہ ایک آدمی محمد علی جناح ہے جس کو قائد اعظم کہتے ہیں۔ اس نے مسلمانوں کے لئے ایک علاحدہ ملک بنایا ہے جس کا نام پاکستان ہے --- یہ کہاں ہے --- اس کا محل وقوع کیا ہے۔ اس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پاگل خانے میں وہ سب پاگل جن کا دماغ پوری طرح ماؤف نہیں ہوا تھا، اس مخمصے میں گرفتار تھے کہ وہ پاکستان میں ہیں یا ہندستان میں۔ اگر ہندستان میں ہیں تو پاکستان کہاں ہے۔ اگر وہ پاکستان میں ہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ عرصہ پہلے یہیں رہتے ہوئے بھی ہندستان میں تھے۔

ایک پاگل تو پاکستان اور ہندستان، اور ہندستان اور پاکستان کے چکر میں کچھ ایسا گرفتار ہوا کہ اور زیادہ پاگل ہو گیا۔ جھاڑو دیتے دیتے ایک دن درخت پر چڑھ گیا اور ٹہنی پر بیٹھ کر دو گھنٹے مسلسل تقریر کرتا رہا، جو پاکستان اور ہندستان کے نازک مسئلے پر تھی۔ سپاہیوں نے اسے نیچے اُترنے کو کہا تو وہ اور اوپر چڑھ گیا۔ ڈرایا دھمکایا گیا تو اس نے کہا۔ "میں ہندستان میں رہنا چاہتا ہوں نہ پاکستان میں۔ ۔ میں اس درخت پر ہی رہوں گا۔"

بڑی مشکلوں کے بعد جب اس کا دورہ سرد پڑا تو وہ نیچے اُترا اور اپنے ہندو سکھ دوستوں سے گلے مل مل کر رونے لگا۔ اس خیال سے اس کا دل بھر آیا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر ہندوستان چلے جائیں گے۔

ایک ایم ایس سی پاس ریڈیو انجینئر مین جو مسلمان تھا اور دوسرے پاگلوں سے بالکل الگ تھلگ باغ کی ایک خاص روش پر سارا دن خاموش ٹہلتا رہتا تھا۔ یہ تبدیلی نمودار ہوئی کہ اُس نے تمام کپڑے اتار کر دفعدار کے حوالے کر دیئے اور ننگ دھڑنگ سارے باغ میں چلنا پھرنا شروع کر دیا۔

چنیوٹ کے ایک موٹے مسلمان پاگل نے جو مسلم لیگ کا سرگرم کارکن رہ چکا تھا اور دن میں پندرہ سولہ مرتبہ نہایا کرتا تھا، یک لخت یہ عادت ترک کر دی۔ اس کا نام محمد علی تھا۔ چنانچہ ایک دن اس نے اپنے جنگلے میں اعلان کر دیا کہ وہ قائد اعظم محمد علی جناح ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی ایک سکھ پاگل ماسٹر تارا سنگھ بن گیا۔ قریب تھا کہ اس جنگلے میں خون خرابہ ہو جائے مگر دونوں کو خطرناک پاگل قرار دے کر علاحدہ علاحدہ بند کر دیا گیا۔

لاہور کا ایک نوجوان ہندو وکیل تھا جو محبت میں ناکام ہو کر پاگل ہو گیا تھا۔ جب اُس نے سنا کہ امرتسر ہندستان میں چلا گیا ہے تو اسے بہت دکھ ہوا۔ اسی شہر کی ایک ہندو لڑکی سے اسے محبت ہوئی تھی۔ گو اُس نے اس وکیل کو ٹھکرا دیا تھا مگر دیوانگی کی حالت میں بھی وہ اس کو نہیں بھولا تھا۔ چنانچہ وہ ان تمام ہندو اور مسلم لیڈروں کو گالیاں دیتا تھا، جنہوں نے مل ملا کر ہندوستان کے دو ٹکڑے کر دئے۔ ۔ اس کی محبوبہ ہندستانی بن گئی اور وہ پاکستانی۔

جب تبادلے کی بات شروع ہوئی تو وکیل کو کئی پاگلوں نے سمجھایا کہ وہ دل بُرا نہ کرے۔ اس کو ہندوستان بھیج دیا جائے گا۔ اُس ہندوستان میں جہاں اس کی محبوبہ رہتی ہے مگر وہ لاہور چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے کہ اُس کا خیال تھا کہ امرتسر میں اس کی پریکٹس نہیں چلے گی۔

یوروپین وارڈ میں دو اینگلو انڈین پاگل تھے۔ ان کو جب معلوم ہوا کہ ہندوستان کو آزاد کر کے انگریز چلے گئے ہیں تو ان کو بہت صدمہ ہوا۔ وہ چھپ چھپ کر گھنٹوں آپس میں اس اہم مسئلے پر گفتگو کرتے رہتے کہ پاگل خانے میں اب ان کی حیثیت کس قسم کی ہوگی۔ یوروپین وارڈ رہے گا یا اڑا دیا جائے گا۔ بریک فاسٹ ملا کرے گا یا نہیں۔ کیا انھیں ڈبل روٹی کے بجائے بلڈی انڈین چپاتی تو زہر مار نہیں کرنا پڑے گی۔

ایک سکھ تھا جس کو پاگل خانے میں داخل ہوئے پندرہ برس ہو چکے تھے۔ ہر وقت اس کی

زبان سے یہ عجیب و غریب الفاظ سننے میں آتے تھے "اوپڑ دی گڑ گڑ دی انیکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف دی لالٹین۔" دن کو سوتا تھا نہ رات کو۔ پہرہ داروں کا یہ کہنا تھا کہ پندرہ برس کے طویل عرصے میں وہ ایک لحظے کے لئے نہیں سویا۔ لیٹا بھی نہیں تھا۔ البتہ کبھی کبھی کسی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لیتا تھا۔

ہر وقت کھڑا رہنے سے اس کے پاؤں سوج گئے تھے۔ پنڈلیاں بھی پھول گئی تھیں، مگر اس جسمانی تکلیف کے باوجود لیٹ کر آرام نہیں کرتا تھا۔ ہندستان، پاکستان اور پاگلوں کے تبادلے کے متعلق جب کبھی پاگل خانے میں گفتگو ہوتی تھی تو وہ غور سے سنتا تھا۔ کوئی اس سے پوچھتا کہ اس کا کیا خیال ہے تو وہ بڑی سنجیدگی سے جواب دیتا۔ اوپڑ دی گڑ گڑ دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف دی پاکستان گورنمنٹ۔"

لیکن بعد میں "آف دی پاکستان گورنمنٹ" کی جگہ 'اوف دی ٹوبہ ٹیک سنگھ گورنمنٹ' نے لے لی اور اس نے دوسرے پاگلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے۔ جہاں کا وہ رہنے والا ہے۔ لیکن کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ پاکستان میں ہے یا ہندستان میں۔ جو بتانے کی کوشش کرتے تھے وہ خود اس الجھاؤ میں گرفتار ہو جاتے تھے کہ سیالکوٹ پہلے ہندستان میں ہوتا تھا پر اب سنا ہے کہ پاکستان میں ہے۔ کیا پتا ہے کہ لاہور جو اب پاکستان میں ہے کل ہندستان میں چلا جائے۔ یا سارا ہندستان ہی پاکستان بن جائے اور یہ بھی کون سینہ پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا تھا کہ ہندستان اور پاکستان دونوں کسی دن سرے سے غائب ہی ہو جائیں۔

اس سکھ پاگل کے کیس چھدرے ہو کر بہت مختصر رہ گئے تھے۔ چونکہ بہت کم نہاتا تھا اس لئے سر اور داڑھی کے بال آپس میں جم گئے تھے۔ جس کے باعث اس کی شکل بڑی بھیانک ہو گئی تھی۔ مگر آدمی بے ضرر تھا۔ پندرہ برسوں میں اس نے کبھی کسی سے جھگڑا فساد نہیں کیا تھا۔ پاگل خانے کے جو پرانے ملازم تھے وہ اس کے متعلق اتنا جانتے تھے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں اس کی کئی زمینیں تھیں۔ اچھا کھاتا پیتا زمیندار تھا کہ اچانک دماغ الٹ گیا۔ اس کے رشتہ دار لوہے کی موٹی موٹی زنجیروں میں اُسے باندھ کر لائے اور پاگل خانے میں داخل کرا گئے۔

مہینے میں ایک بار ملاقات کے لئے یہ لوگ آتے تھے اور اس کی خیر خیریت دریافت کر کے چلے جاتے تھے ایک مدت تک یہ سلسلہ جاری رہا، پر جب پاکستان، ہندستان کی گڑبڑ شروع ہوئی تو ان کا آنا بند ہو گیا۔

اس کا نام بشن سنگھ تھا مگر سب اسے ٹوبہ ٹیک سنگھ کہتے تھے۔ اس کو یہ قطعاً معلوم نہیں تھا کہ دن کون سا ہے، مہینہ کون سا ہے، یا کتنے سال بیت چکے ہیں لیکن ہر مہینے جب اس کے عزیز و اقارب اس سے ملنے کے لئے آتے تھے تو اسے اپنے آپ پتا چل جاتا تھا۔ چنانچہ وہ دفعدار سے کہتا کہ اس کی ملاقات آ رہی ہے۔ اس دن وہ اچھی طرح نہاتا، بدن پر خوب صابن گھستا اور سر میں تیل لگا کر کنگھا کرتا، اپنے کپڑے جو وہ کبھی استعمال نہیں کرتا تھا نکلوا کے پہنتا اور یوں سج کر ملنے والوں کے پاس جاتا۔ وہ اس سے کچھ پوچھتے تو وہ خاموش رہتا یا کبھی کبھار "اوپڑ دی گڑ دی انیکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف دی لالٹین۔" کہہ دیتا۔

اس کی ایک لڑکی تھی جو ہر مہینہ ایک انگلی بڑھتی بڑھتی پندرہ برسوں میں جوان ہو گئی تھی۔ بشن سنگھ اس کو پہچانتا ہی نہیں تھا۔ وہ بچی تھی جب بھی اپنے باپ کو دیکھ کر روتی تھی، جوان ہوئی تب بھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے تھے۔

پاکستان اور ہندستان کا قصہ شروع ہوا تو اس نے دوسرے پاگلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے۔ جب اطمینان بخش جواب نہ ملا تو اس کی کرید دن بدن بڑھتی گئی۔ اب ملاقات بھی نہیں آتی تھی۔ پہلے تو اسے اپنے آپ پتا چل جاتا تھا کہ ملنے والے آ رہے ہیں، پر اب جیسے اس کے دل کی آواز بھی بند ہو گئی تھی جو اسے ان کی آمد کی خبر دے دیا کرتی تھی۔

اس کی بڑی خواہش تھی کہ وہ لوگ آئیں جو اس سے ہمدردی کا اظہار کرتے تھے اور اس کے لئے پھل، مٹھائیاں اور کپڑے لاتے تھے۔ وہ اگر ان سے پوچھتا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے تو وہ یقیناً اُسے بتا دیتے کہ پاکستان میں ہے یا ہندستان میں۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وہ ٹوبہ ٹیک سنگھ ہی سے آتے ہیں جہاں اس کی زمینیں ہیں۔

پاگل خانے میں ایک پاگل ایسا بھی تھا جو خود کو خدا کہتا تھا۔ اس سے جب ایک روز بشن سنگھ نے پوچھا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ پاکستان میں ہے یا ہندستان میں تو اس نے حسب عادت قہقہہ لگایا اور کہا "وہ پاکستان میں ہے نہ ہندوستان میں اس لئے کہ ہم نے ابھی تک حکم نہیں دیا۔"

بشن سنگھ نے اس خدا سے کئی مرتبہ بڑی منت سماجت سے کہا کہ وہ حکم دے دے تاکہ جھنجھٹ ختم ہو مگر وہ بہت مصروف تھا اس لئے کہ اسے اور بے شمار حکم دینے تھے۔ ایک دن تنگ آ کر وہ اس پر برس پڑا۔ "اوپڑ دی گڑ گڑ دی انیکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف واہے گورو جی دا خالصہ اینڈ واہے گورو جی کی فتح۔ جو بولے سو نہال، ست سری اکال۔"

اس کا شاید یہ مطلب تھا کہ تم مسلمانوں کے خدا ہو۔ سکھوں کے خدا ہوتے تو ضرور میری سنتے۔

تبادلے سے کچھ دن پہلے ٹوبہ ٹیک سنگھ کا ایک مسلمان جو اس کا دوست تھا، ملاقات کے لئے آیا۔ پہلے وہ کبھی نہیں آیا تھا۔ جب بشن سنگھ نے اسے دیکھا تو ایک طرف ہٹ گیا اور واپس جانے لگا مگر سپاہیوں نے اسے روکا "یہ تم سے ملنے آیا ہے۔ تمہارا دوست فضل دین ہے۔"

بشن سنگھ نے فضل دین کو ایک نظر دیکھا اور بڑبڑانے لگا۔ فضل دین نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "میں بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ تم سے ملوں لیکن فرصت ہی نہ ملی۔ تمہارے سب آدمی خیریت سے ہندستان چلے گئے تھے۔ مجھ سے جتنی مدد ہو سکی میں نے کی۔۔۔ تمہاری بیٹی روپ کور۔"

وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ بشن سنگھ کچھ یاد کرنے لگا "بیٹی روپ کور۔"

فضل دین نے رک رک کر کہا "ہاں۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ ان کے ساتھ ہی چلی گئی تھی۔"

بشن سنگھ خاموش رہا۔ فضل دین نے کہنا شروع کیا۔ "انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہاری خیر خیریت پوچھتا رہوں۔ اب میں نے سنا ہے کہ تم ہندستان جا رہے ہو۔۔۔ بھائی بلبیر سنگھ اور بھائی ودھاوا سنگھ سے میرا سلام کہنا۔۔۔ اور بہن امرت کور سے بھی۔۔۔ بھائی بلبیر سے کہنا، فضل دین راضی خوشی ہے۔۔۔ دو بھوری بھینسیں جو وہ چھوڑ گئے ہیں، ان میں سے ایک نے کٹا دیا ہے۔ دوسری کے کٹی ہوئی تھی پر وہ چھ دن کی ہو کے مر گئی۔۔۔ اور۔۔۔ میرے لائق جو خدمت ہو، کہنا، میں ہر وقت تیار ہوں۔۔۔ اور یہ تمہارے لئے تھوڑے سے مرونڈے لایا ہوں۔"

بشن سنگھ نے مرونڈوں کی پوٹلی لے کر پاس کھڑے سپاہی کے حوالے کر دی اور فضل دین سے پوچھا "ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے؟"

فضل دین نے قدرے حیرت سے کہا "کہاں ہے۔۔۔ وہیں ہے جہاں تھا۔"

بشن سنگھ نے پھر پوچھا "پاکستان میں یا ہندستان میں؟"

"ہندستان میں ۔۔۔ نہیں نہیں پاکستان میں۔" فضل دین بوکھلا سا گیا۔

بشن سنگھ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ "اوپڑدی گڑگڑدی انیکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف دی پاکستان اینڈ ہندوستان آف دی دُر فٹے منہ۔"

تبادلے کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آنے والے پاگلوں کی فہرستیں پہنچ گئی تھیں اور تبادلے کا دن بھی مقرر ہو چکا تھا۔

سخت سردیاں تھیں جب لاہور کے پاگل خانے سے ہندو سکھ پاگلوں سے بھری ہوئی لاریاں پولیس کے محافظ دستے کے ساتھ روانہ ہوئیں۔ متعلقہ افسر بھی ہمراہ تھے۔ واہگہ کے بورڈر پر طرفین کے سپرنٹنڈنٹ ایک دوسرے سے ملے اور ابتدائی کاروائی ختم ہونے کے بعد تبادلہ شروع ہو گیا جو رات بھر جاری رہا۔

پاگلوں کو لاریوں سے نکالنا اور ان کو دوسرے افسروں کے حوالے کرنا بڑا کٹھن کام تھا۔ بعض تو باہر نکلتے ہی نہیں تھے۔ جو نکلنے پر رضا مند ہوتے تھے ان کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ کیونکہ وہ اِدھر اُدھر بھاگ اُٹھتے تھے، جو ننگے تھے ان کو کپڑے پہنائے جاتے تو وہ پھاڑ کر اپنے تن سے جدا کر دیتے۔ کوئی گالیاں بک رہا ہے کوئی گا رہا ہے۔ آپس میں لڑ جھگڑ رہے ہیں۔ رو رہے ہیں، بلک رہے ہیں۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ پاگل عورتوں کا شور و غوغا الگ تھا اور سردی اتنی کڑاکے کی تھی کہ دانت سے دانت بج رہے تھے۔

پاگلوں کی اکثریت اس تبادلے کے حق میں نہیں تھی۔ اس لئے کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انھیں اپنی جگہ سے اکھاڑ کر کہاں پھینکا جا رہا ہے۔ وہ چند جو کچھ سمجھ سکتے تھے "پاکستان زندہ باد!" اور "پاکستان مردہ باد" کے نعرے لگا رہے تھے۔ دو تین مرتبہ فساد ہوتے ہوتے بچا، کیونکہ بعض مسلمانوں اور سکھوں کو یہ نعرے سن کر طیش آ گیا تھا۔

جب بشن سنگھ کی باری آئی اور واہگہ کے اُس پار متعلقہ افسر اس کا نام رجسٹر میں درج کرنے لگا تو اس نے پوچھا "ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے۔ پاکستان میں یا ہندستان میں؟"

متعلقہ افسر ہنسا "پاکستان میں"۔

یہ سن کر بشن سنگھ اچھل کر ایک طرف ہٹا اور دوڑ کر اپنے باقی ماندہ ساتھیوں کے پاس پہنچ گیا۔ پاکستانی سپاہیوں نے اُسے پکڑ لیا اور دوسری طرف لے جانے لگے، مگر اس نے چلنے سے انکار کر دیا۔ "ٹوبہ ٹیک سنگھ یہاں ہے۔" اور زور زور سے چلانے لگا۔ "اوپڑدی گڑگڑدی انیکس دی بے دھیانا دی مونگ دی دال آف ٹوبہ ٹیک سنگھ اینڈ پاکستان۔"

اسے بہت سمجھایا گیا کہ دیکھو اب ٹوبہ ٹیک سنگھ ہندستان میں چلا گیا ہے۔۔ اگر نہیں گیا تو اسے فوراً وہاں بھیج دیا جائے گا مگر وہ نہ مانا۔ جب اس کو زبردستی دوسری طرف لے جانے کی کوشش کی گئی تو وہ درمیان میں ایک جگہ اس انداز میں اپنی سوجی ہوئی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا جیسے اب اسے کوئی طاقت وہاں سے نہیں ہلا سکے گی۔

آدمی چونکہ بے ضرر تھا اس لئے اس سے مزید زبردستی نہ کی گئی اس کو وہیں کھڑا رہنے دیا گیا اور تبادلے کا باقی کام ہوتا رہا۔

سورج نکلنے سے پہلے ساکت و صامت بشن سنگھ کے حلق سے ایک فلک شگاف چیخ نکلی۔ اِدھر اُدھر سے کئی افسر دوڑے آئے اور دیکھا کہ وہ آدمی جو پندرہ برس تک دن رات اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہا تھا، اوندھے منہ لیٹا ہوا ہے۔ اِدھر خاردار تاروں کے پیچھے ہندوستان تھا۔ اُدھر ویسے ہی تاروں کے پیچھے پاکستان۔ درمیان میں زمین کے اس ٹکڑے پر جس کا کوئی نام نہیں تھا، ٹوبہ ٹیک سنگھ پڑا تھا۔ ● ●

سعادت حسن منٹو

بادشاہت کا خاتمہ

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ من موہن پاس ہی بیٹھا تھا۔ اس نے ریسیور اٹھایا اور کہا "ہیلو۔" فور فور فائیو سیون۔

دوسری طرف سے پتلی سی نسوانی آواز آئی۔ "سوری۔" رونگ نمبر۔

منموہن نے ریسیور رکھ دیا اور کتاب پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔

یہ کتاب وہ تقریباً بیس مرتبہ پڑھ چکا تھا۔ اس لئے نہیں کہ اس میں کوئی خاص بات تھی، دفتر جو ویران پڑا تھا۔ ایک صرف یہی کتاب تھی۔ جس کے آخری اوراق کرم خوردہ تھے۔

ایک ہفتے سے دفتر منموہن کی تحویل میں تھا۔ کیونکہ اس کا مالک جو کہ اس کا دوست تھا کچھ روپیہ قرض لینے کے لئے کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ من موہن کے پاس چونکہ رہنے کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ اس لئے فٹ پاتھ سے عارضی طور پر وہ اس دفتر میں منتقل ہو گیا تھا۔ اور اس ایک ہفتے میں وہ دفتر کی اکلوتی کتاب تقریباً بیس مرتبہ پڑھ چکا تھا۔

دفتر میں وہ اکیلا پڑا رہتا۔ نوکری سے اسے نفرت تھی۔ اگر وہ چاہتا تو کسی بھی فلم کمپنی میں بطور فلم ڈائرکٹر کے ملازم ہو سکتا تھا مگر وہ غلامی نہیں چاہتا تھا۔ نہایت ہی بے ضرر اور مخلص آدمی تھا۔ اس لئے دوست یار اس کے روزانہ اخراجات کا بندوبست کر دیتے تھے۔ یہ اخراجات بہت ہی کم تھے۔ صبح کو چائے کی پیالی اور دو توس۔ دوپہر کو دو پھلکے اور تھوڑا سا سالن سارے دن میں ایک پیکٹ سگریٹ اور بس۔

من موہن کا کوئی عزیز یا رشتے دار نہیں تھا۔ بے حد خاموش پسند تھا۔ جفاکش تھا۔ کئی کئی دن فاقے سے رہ سکتا تھا۔ اس کے متعلق اس کے دوست اور تو کچھ نہیں لیکن اتنا جانتے تھے کہ وہ بچپن ہی سے گھر چھوڑ چھاڑ کے نکل آیا تھا۔ اور ایک مدت سے بمبئی کے فٹ پاتھوں پر آباد تھا۔ زندگی میں اس کو صرف ایک چیز کی حسرت تھی۔ عورت کی محبت کی۔ وہ کہا کرتا تھا۔ اگر مجھے کسی عورت کی محبت مل گئی تو میری ساری زندگی بدل جائے گی۔

دوست اس سے کہتے تم کام پھر بھی نہ کرو گے۔

منموہن آہ بھر کر جواب دیتا۔ "کام؟ میں مجسم کام بن جاؤں گا۔"

دوست کہتے تو شروع کر دو کسی سے عشق۔

منموہن جواب دیتا نہیں۔ میں ایسے عشق کا قائل نہیں جو مرد کی طرف سے شروع ہو۔

دوپہر کے کھانے کا وقت قریب آ رہا تھا۔ منموہن نے سامنے دیوار پر کلاک کی طرف دیکھا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنا شروع ہوئی۔ اس نے ریسیور اٹھایا اور کہا "ہیلو؟ فور فور فائیو سیون۔

دوسری طرف سے پتلی سی آواز آئی۔ فور فور فائیو سیون پر من موہن نے جواب دیا 'جی ہاں۔'

نسوانی آواز نے جواب پوچھا "آپ کون ہیں؟"

میں من موہن "فرمایئے۔"

دوسری طرف سے آواز آئی تو منموہن نے کہا فرمایئے کس سے بات کرنا چاہتی ہیں آپ؟"

آواز نے جواب دیا "آپ سے۔"

من موہن نے ذرا حیرت سے پوچھا "مجھ سے؟"

"جی ہاں۔ آپ سے، کیا آپ کو کوئی اعتراض ہے۔"

من موہن سٹپٹا سا گیا "جی؟۔۔ جی نہیں!"

آواز مسکرائی "آپ نے اپنا نام مدن موہن بتایا تھا۔"

"جی نہیں۔۔ من موہن۔"

"من موہن۔"

چند لمحات خاموشی میں گزر گئے تو منموہن نے کہا "آپ باتیں کرنا چاہتی تھیں مجھ سے؟"

آواز آئی۔ "جی ہاں۔"

"تو کیجئے۔"

تھوڑے وقفے کے بعد آواز آئی۔ "سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا بات کروں۔ آپ ہی شروع کیجئے نہ کوئی بات۔"

"بہت بہتر" یہ کہہ کر من موہن نے تھوڑی دیر سوچا "نام اپنا بتا چکا ہوں۔ عارضی طور پر ٹھکانا میرا یہ دفتر ہے۔ پہلے فٹ پاتھ پر سوتا تھا۔ اب ایک ہفتے سے اس دفتر کے بڑے میز پر سوتا ہوں؟"

آواز مسکرائی "فٹ پاتھ پر آپ مسہری لگا کر سوتے تھے؟"

من موہن ہنسا "اس سے پہلے کہ میں آپ سے مزید گفتگو کروں۔ میں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ فٹ پاتھوں پر سوتے سوتے مجھے ایک زمانہ ہو گیا ہے۔ یہ دفتر تقریباً ایک ہفتے سے میرے قبضے میں ہے۔ آج کل عیش کر رہا ہوں۔"

آواز مسکرائی۔ "کیسے عیش؟"

من موہن نے جواب دیا "ایک کتاب مل گئی تھی یہاں سے۔ آخری اوراق گم ہیں۔ لیکن میں اسے بیس مرتبہ پڑھ چکا ہوں۔ سالم کتاب کبھی ہاتھ لگی تو معلوم ہوگا۔ ہیرو ہیروئن کے عشق کا کیا انجام ہوا۔"

آواز ہنسی۔ "آپ بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔"

من موہن نے تکلف سے کہا "آپ کی ذرہ نوازی ہے۔"

آواز نے تھوڑے توقف کے بعد پوچھا "آپ کا شغل کیا ہے۔"

"شغل؟"

"میرا مطلب آپ کرتے کیا ہیں؟"

"کیا کرتا ہوں؟ کچھ بھی نہیں۔ ایک بیکار انسان کیا کر سکتا ہے۔ سارا دن آوارہ گردی کرتا ہوں۔ رات کو سو جاتا ہوں۔"

آواز نے پوچھا "یہ زندگی آپ کو اچھی لگتی ہے۔"

من موہن سوچنے لگا۔ "ٹھہریے۔ بات دراصل یہ ہے کہ کسی نے اس پر کبھی غور نہیں کیا۔

اب آپ نے پوچھا ہے تو میں اپنے آپ سے پوچھ رہا ہوں کہ یہ زندگی تمہیں اچھی لگتی ہے یا نہیں؟"

"کوئی جواب ملا؟"

تھوڑے وقفے کے بعد من موہن نے جواب دیا "جی نہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ایسی زندگی مجھے اچھی لگتی ہی ہوگی جب کہ ایک عرصے سے بسر کر رہا ہوں۔

آواز ہنسی۔ من موہن نے کہا "آپ کی ہنسی بڑی مترنم ہے۔"

آواز شرما گئی۔ شکریہ! اور سلسلۂ گفتگو منقطع کر دیا۔

منموہن تھوڑی دیر ریسیور ہاتھ میں لئے کھڑا رہا۔ پھر مسکرا کر اسے رکھ دیا۔ اور دفتر بند کر کے چلا گیا۔

دوسرے روز صبح آٹھ بجے جب کہ من موہن دفتر کے بڑے میز پر سو رہا تھا ٹیلیفون کی گھنٹی بجنا شروع ہوئی۔ جمائیاں لیتے ہوئے اس نے ریسیور اٹھایا اور کہا۔

"ہیلو فور فور فائیو سیون۔"

دوسری طرف سے آواز آئی "آداب عرض من موہن صاحب۔"

"آداب عرض" من موہن ایک دم چونکا۔ "اوہ، آپ۔"

آداب عرض" تسلیمات!"

آواز آئی۔ "آپ غالباً سو رہے تھے؟"

"جی ہاں! یہاں آ کر میری عادت کچھ بگڑ رہی ہیں۔ واپس فٹ پاتھ پر گیا تو بڑی مصیبت ہو جائے گی۔"

آواز مسکرائی۔ "کیوں۔"

"وہاں صبح پانچ بجے سے پہلے پہلے اٹھنا پڑتا ہے۔"

آواز ہنسی۔ من موہن نے پوچھا "کل آپ نے ایک دم ٹیلیفون بند کر دیا۔"

آواز شرمائی۔ "آپ نے میری ہنسی کی تعریف کیوں کی تھی۔"

من موہن نے کہا "تو صاحب یہ بھی عجیب بات کہی آپ نے۔ کوئی چیز خوبصورت ہو تو اس کی تعریف نہیں کرنی چاہیے۔"؟

"بالکل نہیں۔"

"یہ شرط آپ مجھ پر عائد نہیں کر سکتیں۔ میں نے آج تک کوئی شرط اپنے اوپر عائد نہیں ہونے دی۔ آپ ہنسیں گی تو میں ضرور تعریف کروں گا۔"

"میں ٹیلیفون بند کر دوں گی۔"

"بڑے شوق سے۔"

"آپ کو میری ناراضگی کا کوئی خیال۔"

"میں سب سے پہلے اپنے آپ کو ناراض نہیں کرنا چاہتا۔ اگر میں آپ کی ہنسی کی تعریف نہ کروں تو میرا ذوق مجھ سے ناراض ہو جائے گا۔ یہ ذوق مجھے بہت عزیز ہے!"

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ اس کے بعد دوسری طرف سے آواز آئی معاف کیجئے گا۔ میں ملازمہ سے کچھ کہہ رہی تھی۔ آپ کا ذوق آپ کو بہت عزیز ہے۔۔ہاں یہ تو بتائیے آپ کو شوق کس چیز کا ہے۔؟"

"کیا مطلب؟"

یعنی۔ کوئی شغل۔ کوئی کام۔ میرا مطلب ہے آپ کو آتا کیا ہے؟"

من موہن ہنسا "کوئی کام نہیں آتا۔ فوٹوگرافی کا تھوڑا سا شوق ہے۔"

"بہت اچھا شوق ہے۔"

"اس کی اچھائی یا برائی کو میں نے کبھی نہیں سوچا۔"

آواز نے پوچھا۔ "کیمرہ تو آپ کے پاس بہت اچھا ہوگا۔"

من موہن ہنسا "میرے پاس اپنا کوئی کیمرہ نہیں۔ دوستوں سے مانگ کر شوق پورا کر لیتا ہوں۔ اگر میں نے کبھی کچھ کمایا تو ایک کیمرہ میری نظر میں ہے۔ وہ خریدوں گا۔"

آواز نے پوچھا "کون سا کیمرہ؟"

من موہن نے جواب دیا "اکیزکٹا۔ ریفلکس کیمرہ ہے مجھے بہت پسند ہے۔"

تھوڑی دیر خاموش رہی۔ اس کے بعد آواز آئی "میں کچھ سوچ رہی تھی۔"

"کیا؟"

آپ نے میرا نام پوچھا نہ ٹیلیفون نمبر دریافت کیا۔"

"مجھے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی؟"

"کیوں؟"

نام آپ کا کچھ بھی ہو کیا فرق پڑتا ہے۔ آپ کو میرا نمبر معلوم ہے۔ بس ٹھیک ہے۔ آپ اگر چاہیں گی کہ میں آپ کو ٹیلیفون کروں تو بتا دیجئے گا۔"

"میں نہیں بتاؤں گی۔"

"لو صاحب یہ بھی خوب رہا۔ میں جب آپ سے پوچھوں گا ہی نہیں تو بتانے نہ بتانے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔"

آواز مسکرائی۔ "آپ عجیب و غریب آدمی ہیں۔"

من موہن مسکرایا "جی ہاں کچھ ایسا ہی آدمی ہوں۔"

چند سکنڈ خاموش رہی "آپ پھر سوچنے لگیں۔"

"جی ہاں، کوئی اور بات اس وقت سوجھ نہیں رہی تھی۔"

"تو ٹیلیفون بند کر دیجئے۔ پھر سہی۔"

آواز کس قدر تیکھی ہو گئی۔ "آپ بہت روکھے آدمی ہیں۔ ٹیلیفون بند کر دیجئے۔ لیجئے میں بند کرتی ہوں۔"

من موہن نے ریسیور رکھ دیا اور مسکرانے لگا۔

آدھے گھنٹے کے بعد جب منموہن ہاتھ منہ دھو کر کپڑے پہن کر باہر نکلنے کے لئے تیار ہوا تو ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ اور کہا فور فور فائیو سیون۔"

آواز آئی۔ "مسٹر من موہن؟"

من موہن نے جواب دیا "جی ہاں من موہن۔ ارشاد۔"

آواز مسکرائی۔ "ارشاد یہ ہے کہ میری ناراضگی دور ہو گئی ہے۔"

من موہن نے بڑی شگفتگی سے کہا "مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ ناشتہ کرتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ آپ کے ساتھ بگاڑنی نہیں چاہیے۔ ہاں آپ نے ناشتہ کر لیا۔"

"جی نہیں باہر نکلنے ہی والا تھا کہ آپ نے ٹیلیفون کیا۔"

"اوہ۔۔تو آپ جائیے۔"

"جی نہیں مجھے کوئی جلدی نہیں۔ میرے پاس پیسے نہیں ہیں اس لئے میرا خیال ہے کہ آج ناشتہ نہیں ہوگا۔"

"آپ کی باتیں سن کر۔۔آپ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں۔ میرا مطلب ہے ایسی باتیں آپ اس لئے کرتے ہیں کہ آپ کو دکھ ہوتا ہے؟"

من موہن نے ایک لحہ سوچا جی نہیں۔ میرا اگر کوئی درد ہے تو میں اس کا عادی ہو چکا ہوں۔"

آواز نے پوچھا "میں کچھ روپے بھیج دوں۔"

من موہن نے جواب دیا "بھیج دیجئے میرے فانسروں میں ایک آپ کا بھی اضافہ ہو جائے گا۔"

"نہیں میں نہیں بھیجوں گی۔"

آپ کی مرضی۔

"میں ٹیلیفون بند کرتی ہوں۔"

"بہتر"

من موہن نے ریسیور رکھ دیا اور مسکراتا ہوا دفتر سے نکل گیا۔

رات کے دس بجے کے قریب واپس آیا۔ اور کپڑے بدل کر میز پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ یہ کون ہے جو اسے فون کرتی ہے آواز سے صرف اتنا پتہ چلتا تھا کہ جوان ہے۔ ہنسی بہت ہی مترنم ہے۔ گفتگو سے یہ صاف ظاہر ہے کہ تعلیم یافتہ اور مہذب ہے بہت دیر تک وہ اس کے متعلق سوچتا رہا۔ ادھر کلاک نے گیارہ بجائے۔ ادھر ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ من موہن نے ریسیور اٹھایا "ہیلو۔"

دوسری طرف سے آواز آئی۔ "مسٹر من موہن"

"جی ہاں۔۔ من موہن۔۔۔ ارشاد"

ارشاد یہ ہے کہ میں نے آج دن میں کئی مرتبہ رنگ کیا۔ آپ کہاں غائب تھے؟"

"صاحب بیکار ہوں پھر بھی کام پر جاتا ہوں۔"

"کس کام پر۔"

"آوارہ گردی"

"واپس کب آئے۔"

"دس بجے"

"اب کیا کر رہے تھے؟"

"میز پر لیٹا آپ کی آواز سے آپ کی تصویر بنا رہا تھا۔"

"بنی؟"

"جی نہیں۔"

"بنانے کی کوشش نہ کیجئے۔ میں بڑی بدصورت ہوں۔"

"معاف کیجئے گا اگر آپ واقعی بدصورت ہیں تو ٹیلیفون بند کر دیجئے۔ بدصورتی سے مجھے نفرت ہے۔"

" آواز مسکرائی۔ "ایسا ہے تو چلیے میں خوبصورت ہوں۔" میں آپ کے دل میں نفرت نہیں پیدا کرنا چاہتی۔"

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ من موہن نے پوچھا "کچھ سوچنے لگیں؟"

آواز چونکی۔ "جی نہیں۔ میں آپ سے پوچھنے والی تھی کہ۔۔"

"سوچ لیجئے اچھی طرح۔"

آواز ہنس پڑی۔ "آپ کو گانا سناؤں؟"

"ضرور"

"ٹھہرئیے۔"

گلا صاف کرنے کی آواز آئی۔ پھر غالب کی یہ غزل شروع ہوئی۔

نکتہ چیں ہے غم دل۔۔۔

سہگل والی نئی دھن تھی۔ آواز میں درد اور خلوص تھا جب غزل ختم ہوئی تو من موہن نے داد دی "بہت خوب۔۔۔ زندہ رہو۔۔"

آواز شرما گئی۔ شکریہ۔ اور ٹیلیفون بند کر دیا۔

دفتر کے بڑے میز پر من موہن کے دل و دماغ میں ساری رات غالب کی غزل گونجتی رہی۔ صبح جلدی اٹھا اور ٹیلیفون کا انتظار کرنے لگا۔ تقریباً ڈھائی گھنٹے کرسی پر بیٹھا رہا۔ مگر ٹیلیفون کی گھنٹی نہ بجی۔ جب مایوس ہو گیا تو ایک عجیب سی تلخی اس نے اپنے حلق میں محسوس کی۔ اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اس کے بعد میز پر لیٹ گیا اور کڑھنے لگا۔ وہی کتاب جس کو وہ متعدد مرتبہ پڑھ چکا تھا اٹھائی اور ورق گردانی شروع کر دی۔ یونہی لیٹے لیٹے شام ہو گئی تقریباً سات بجے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی من موہن نے ریسیور اٹھایا اور تیزی سے پوچھا۔ "کون ہے؟"

وہی آواز آئی "میں۔"

من موہن کا لہجہ تیز رہا "اتنی دیر تم کہاں تھیں۔"

آواز لرزی "کیوں؟"

"میں صبح سے یہاں جھک مار رہا ہوں۔ ناشتہ کیا ہے نہ دوپہر کا کھانا کھایا ہے، حالانکہ میرے پاس پیسے موجود تھے۔"

آواز آئی۔ "میری جب مرضی ہو گی ٹیلیفون کروں گی۔ آپ۔۔"

من موہن نے بات کاٹ کر کہا "دیکھو جی یہ سلسلہ بند کرو ٹیلیفون کرنا ہے تو ایک وقت مقرر کر دو مجھ سے انتظار برداشت نہیں ہوتا۔"

آواز مسکرائی۔ "آج کی معافی چاہتی ہوں۔ کل سے باقاعدہ صبح و شام فون آیا کرے گا آپ کو۔"

"یہ ٹھیک ہے۔"

آواز ہنسی "مجھے معلوم نہیں تھا آپ اس قدر بگڑے دل ہیں۔"

من موہن مسکرایا "معاف کرنا انتظار سے مجھے بہت کوفت ہوتی ہے۔ اور جب مجھے کسی بات سے کوفت ہوتی ہے تو اپنے آپ کو سزا دینا شروع کر دیتا ہوں۔"

"وہ کیسے؟"

"صبح تمہارا ٹیلیفون نہ آیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ میں چلا جاتا۔ لیکن بیٹھا دن بھر اندر ہی اندر کڑھتا رہا۔ بچپنا ہے صاف۔"

آواز ہمدردی میں ڈوب گئی۔ کاش مجھ سے یہ غلطی نہ ہوتی۔ میں نے قصداً صبح ٹیلیفون نہ کیا۔!"

"کیوں؟"

"یہ معلوم کرنے کے لئے کہ آپ انتظار کریں گے یا نہیں؟"

من موہن ہنسا "بہت شریر ہو تم۔ اچھا اب ٹیلیفون بند کرو۔ میں کھانا کھانے جا رہا ہوں۔"

"بہتر کب لوٹیے گا؟"

"آدھے گھنٹے تک۔"

من موہن آدھے گھنٹے کے بعد کھانا کھا کر لوٹا تو اس نے فون کیا۔ دیر تک دونوں باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد اس نے غالب کی ایک غزل سنائی۔ من موہن نے دل سے داد دی۔ پھر ٹیلیفون کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

اب ہر روز صبح و شام من موہن کو اس کا ٹیلیفون آتا۔ گھنٹی کی آواز سنتے ہی وہ ٹیلیفون کی طرف لپکتا۔ بعض اوقات گھنٹوں باتیں جاری رہتیں۔ اس دوران میں من موہن نے اس سے ٹیلیفون کا نمبر پوچھا نہ اس کا نام شروع شروع میں اس نے اس کی آواز کی مدد سے تخیل کے پردے پر اس کی تصویر کھینچنے کی کوشش کی تھی۔ مگر اب وہ صرف آواز ہی سے مطمئن ہو گیا تھا۔ آواز ہی شکل تھی آواز ہی صورت تھی۔ آواز ہی جسم تھا۔ آواز ہی روح تھی۔ ایک دن اس

نے پوچھا "موہن۔ تم میرا نام کیوں نہیں پوچھتے۔"

من موہن نے مسکرا کر کہا "تمہارا نام تمہاری آواز ہے۔ جو کہ بہت مترنم ہے۔"

"اس میں کیا شک ہے؟"

ایک دن وہ بڑا ٹیڑھا سوال کر بیٹھی۔ موہن تم نے کبھی کسی لڑکی سے محبت کی ہے۔"

منوہن نے جواب دیا "نہیں۔"

"کیوں؟"

موہن ایک دم اداس ہو گیا۔ "اس" کیوں" کا جواب چند لفظوں میں نہیں دے سکتا مجھے اپنی زندگی کا سارا ملبہ اٹھانا پڑے گا۔" "اگر کوئی جواب نہ ملے تو بڑی کوفت ہوگی۔"

"جانے دیجئے۔"

ٹیلیفون کا رشتہ قائم ہوئے تقریباً ایک مہینہ ہو گیا۔ بلا ناغہ دن میں دو مرتبہ اس کا فون آتا۔ من موہن کو اپنے دوست کا خط آیا کہ قرضے کا بندوبست ہو گیا ہے۔ سات آٹھ روز میں وہ بمبئی پہونچنے والا ہے۔ من موہن یہ خط پڑھ کر افسردہ ہو گیا۔ اس کا ٹیلیفون آیا تو من موہن نے اس سے کہا "میری دفتر کی بادشاہت اب چند دنوں کی مہمان ہے۔"

اس نے پوچھا "کیوں؟"

من موہن نے جواب دیا "قرضے کا بندوبست ہو گیا۔ دفتر آباد ہونے والا ہے۔"

"تمہارے کسی اور دوست کے گھر میں ٹیلیفون نہیں۔"

"کئی دوست ہیں جن کے ٹیلیفون ہیں۔ مگر میں تمہیں ان کا نمبر نہیں دے سکتا۔"

"وجہ؟"

"میں بہت حاسد ہوں۔"

وہ مسکرائی۔ "یہ تو بڑی مصیبت ہوئی۔"

"کیا کیا جائے؟"

"آخری دن جب تمہاری بادشاہت ختم ہونے والی ہوگی میں تمہیں اپنا نمبر بتا دوں گی۔"

"یہ ٹھیک ہے۔"

من موہن کی ساری افسردگی دور ہو گئی۔ وہ اس دن کا انتظار کرنے لگا کہ دفتر میں اس کی بادشاہت ختم ہو۔ اب پھر اس نے اس کی آواز کی مدد سے اپنے تخیل کے پردے پر اس کی تصویر کھینچنے کی کوشش شروع کی۔ کئی تصویریں بنیں۔ مگر وہ مطمئن نہ ہوا۔ اس نے سوچا، چند دنوں کی بات ہے اس نے ٹیلیفون نمبر بتا دیا تو وہ اسے دیکھ بھی سکے گا۔ اس کا خیال آتے ہی اس کا دل و دماغ سن ہو جاتا۔ میری زندگی کا وہ لمحہ کتنا بڑا لمحہ ہوگا جب میں اس کو دیکھوں گا۔"

دوسرے روز جب اس کا ٹیلیفون آیا تو منوہن نے اس سے کہا "تمہیں دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا ہے۔"

"کیوں؟"

"تم نے کہا تھا کہ آخری دن جب تمہاری بادشاہت ختم ہونے والی ہوگی تو تم مجھے اپنا نمبر بتا دو گی۔"

"کہا تھا۔"

"اس کا یہ مطلب ہے کہ تم مجھے اپنا ایڈریس دیدو گی۔ جس تمہیں دیکھ سکوں گا۔"

"تم مجھے جب چاہو دیکھ سکتے ہو۔ آج ہی دیکھ لو۔"

"نہیں نہیں۔" پھر کچھ سوچ کر کہا "میں ذرا اچھے لباس میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ آج ہی ایک دوست سے کہہ رہا ہوں وہ مجھے سوٹ سلوا دے گا۔"

وہ ہنس پڑی۔ "بالکل بچے ہو تم۔ سنو جب تم مجھ سے ملو گے تو میں تمہیں ایک تحفہ دوں گی۔"

من موہن نے جذباتی انداز میں کہا "تمہاری ملاقات سے بڑھ کر اور کیا تحفہ ہو سکتا ہے۔"

"میں نے تمہارے لئے ایک ایگزکٹا کیمرہ خرید لیا ہے۔"

"اوہ۔"

"اس شرط پر دوں گی کہ پہلے میرا فوٹو اتارو۔"

من موہن مسکرایا۔ "اس شرط کا فیصلہ ملاقات پر کروں گا۔"

تھوڑی دیر اور گفتگو ہوئی اس کے بعد ادھر سے وہ بولی "میں کل اور پرسوں تمہیں ٹیلیفون نہیں کر سکوں گی۔"

من موہن نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا "کیوں؟"

"میں اپنے عزیزوں کے ساتھ کہیں باہر جا رہی ہوں۔ صرف دو دن غیر حاضر رہوں گی مجھے معاف کر دینا۔"

یہ سننے کے بعد من موہن سارا دن دفتر میں رہا دوسرے دن صبح اٹھا تو اس نے حرارت محسوس کی۔ سوچا کہ یہ اضمحلال شاید اس لئے ہے کہ اس ٹیلیفون نہیں آئے گا۔ لیکن دوپہر تک حرارت تیز ہو گئی۔ بدن تپنے لگا۔ آنکھوں کے شرارے پھوٹنے لگے من موہن میز پر لیٹ گیا۔ پیاس بار بار ستاتی تو اٹھتا اور نل سے منہ لگا کر پانی پی لیتا شام کے قریب اسے اپنے سینے پر بوجھ محسوس ہونے لگا۔ دوسرے روز وہ بالکل نڈھال تھا۔ سانس بڑی دقت سے آتا تھا۔ سینے کی دکھن بہت بڑھ گئی تھی۔

کئی بار اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہوئی۔ بخار کی شدت میں وہ گھنٹوں ٹیلیفون پر اپنی محبوب آواز کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ شام کو اس کی حالت بہت زیادہ بگڑ گئی۔ دھندلائی ہوئی آنکھوں سے اس نے کلاک کی طرف دیکھا۔ اس کے کانوں میں عجیب و غریب آوازیں گونج رہی تھی۔ جیسے ہزار ہا ٹیلیفون بول رہے ہوں۔ سینے میں گھنگرو سے بج رہے تھے چاروں طرف آوازیں ہی آوازیں تھیں۔ چنانچہ جب ٹیلیفون کی گھنٹی بجی تو اس کے کانوں تک اس کی آواز نہ پہنچی۔ بہت دیر تک گھنٹی بجتی رہی۔ ایک دم منوہن چونکا۔ اس کے کان اب سن رہے تھے۔ لڑکھڑاتا ہوا اٹھا۔ اور ٹیلیفون تک گیا۔ دیوار کا سہارا لے کر اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ریسیور اٹھایا۔ اور خشک ہونٹوں پر لکڑی جیسی زبان پھیر کر کہا "ہیلو"

دوسری طرف سے وہ لڑکی بولی "ہیلو۔" "منوہن۔"

من موہن کی آواز لڑکھڑائی۔ ہاں من موہن۔"

"ذرا اونچا بولو۔"

من موہن نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر وہ اس کے حلق میں رہی خشک ہو گیا۔

آواز آئی "میں جلدی آ گئی۔ بڑی دیر سے تمہیں رنگ کر رہی ہوں۔

"کہاں تھے تم۔؟"

"من موہن کا سر گھومنے لگا۔"

آواز آئی۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔؟"

من موہن نے بڑی مشکل سے اتنا کہا "میری بادشاہت ختم ہو گئی ہے آج۔"

اس کے منہ سے خون نکلا اور ایک پتلی لکیر کی صورت میں گردن تک دوڑتا چلا گیا۔"

آواز آئی میرا نمبر نوٹ کرلو۔" "فائیو نوٹ تھری ون فور، فائیو نوٹ تھری ون فور۔ صبح فون کرنا۔ یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔ من موہن اوندھے منہ ٹیلیفون پر گر پڑا۔ اس کے منہ سے خون کے بلبلے پھوٹنے لگے۔ (۱۴ جون ۱۹۵۰ء)

● ●

منٹو کے مختصر افسانے

صفائی پسندی

گاڑی رکی ہوئی تھی۔

تین بندوقچی ایک ڈبے کے پاس آئے۔ کھڑکیوں میں سے اندر جھانک کر انہوں نے مسافروں سے پوچھا۔ "کیوں جناب کوئی مرغا ہے؟"

ایک مسافر کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ باقیوں نے جواب دیا "جی نہیں۔"

تھوڑی دیر بعد چار نیزہ بردار آئے۔ کھڑکیوں میں سے اندر جھانک کر انہوں نے مسافروں سے پوچھا کیوں جناب کوئی مرغا ورغا ہے؟"

اس مسافر نے جو پہلے کچھ کہتے کہتے رک گیا تھا، جواب دیا۔

"جی معلوم نہیں۔ آپ اندر آکے سنڈاس میں دیکھ لیجئے۔

نیزہ بردار اندر داخل ہوئے۔ سنڈاس توڑا گیا تو اس میں سے ایک مرغا نکل آیا۔ ایک نزہ بردار نے کہا "کردو حلال۔"

دوسرے نے کہا "نہیں، یہاں نہیں۔ ڈبہ خراب ہو جائے گا۔ باہر لے چلو۔"

اصلاح

"کون ہو تم؟"

"تم کون ہو۔؟"

"ہر ہر مہادیو۔۔۔ ہر ہر مہادیو۔"

"ہر ہر مہادیو۔"

"ثبوت کیا ہے؟"

"ثبوت۔۔۔ میرا نام دھرم چند ہے۔"

"یہ کوئی ثبوت نہیں۔"

"چار ویدوں میں سے کوئی بھی بات مجھ سے پوچھ لو۔"

"ہم ویدوں کو نہیں جانتے۔ ثبوت دو۔"

"کیا؟"

"پائجامہ ڈھیلا کرو۔"

پائجامہ ڈھیلا ہوا تو ایک شور مچ گیا۔ "مار ڈالو۔۔۔ مار ڈالو۔"

"ٹھہرو ٹھہرو۔ میں تمہارا بھائی ہوں۔۔۔ بھگوان کی قسم تمہارا بھائی ہوں۔"

"تو یہ کیا سلسلہ ہے؟"

"جس علاقہ سے آرہا ہوں، وہ ہمارے دشمنوں کا تھا اس لئے مجبوراً مجھے ایسا کرنا پڑا۔۔۔ صرف اپنی جان بچانے کے لئے۔۔۔ ایک یہی چیز غلط ہو گئی ہے۔۔۔ باقی بالکل ٹھیک ہوں۔"

"اڑا دو غلطی کو۔"

غلطی اڑا دی گئی۔۔۔

دھرم چند بھی ساتھ ہی اڑ گیا۔

کرامت

لوٹا ہوا مال برآمد کرنے کے لئے پولس نے چھاپے مارنے شروع کئے۔

لوگ ڈر کے مارے لوٹا ہوا مال رات کے اندھیرے میں باہر پھینکنے لگے۔ کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے اپنا مال بھی موقع پاکر اپنے سے علاحدہ کر دیا تاکہ قانونی گرفت سے بچے رہیں۔

ایک آدمی کو بہت دقت پیش آئی۔ اس کے پاس شکر کی دو بوریاں تھیں۔ جو اس نے پنساری کی دکان سے لوٹی تھیں۔ ایک تو وہ جوں توں رات کے اندھیرے میں پاس والے کنوئیں میں پھینک آیا۔ لیکن جب دوسری اٹھا کر اس میں ڈالنے لگا تو خود بھی ساتھ چلا گیا۔

شور سن کر لوگ اکٹھے ہو گئے۔ کنوئیں میں رسیاں ڈالی گئیں۔ دو جوان نیچے اترے اور اس آدمی کو باہر نکال لیا۔ لیکن چند گھنٹوں کے بعد وہ مر گیا۔

دوسرے دن جب لوگوں نے استعمال کے لئے اس کنوئیں میں سے پانی نکالا تو وہ میٹھا تھا۔ اسی رات اس آدمی کی قبر پر دیے جل رہے تھے۔

آرام کی ضرورت

"مرا نہیں۔۔۔ دیکھو ابھی جان باقی ہے۔"

"رہنے دو یار۔۔۔ میں تھک گیا ہوں۔"

ہمیشہ کی چھٹی

"پکڑ لو۔۔۔ پکڑ لو۔۔۔ دیکھو جانے نہ پائے۔"

شکار تھوڑی سی دوڑ دھوپ کے بعد پکڑ لیا گیا جب نیزے اس کے آر پار ہونے کے لئے آگے بڑھے تو اس نے لرزاں آواز میں گڑگڑا کر کہا"

"مجھے نہ مارو۔۔۔ مجھے نہ مارو۔۔۔ میں تعطیل میں اپنے گھر جا رہا ہوں۔"

پٹھانستان

"خو ایک دم جلدی بولو تم کون اے؟"

"میں۔۔۔ میں۔۔"

"خو شیطان کا بچہ جلدی بولو۔۔۔ اندو اے یا مسلمین؟"

"مسلمین۔"

"خو تمہارا رسول کون اے؟"

"محمد خان۔"

"ٹیک اے۔۔۔ جاؤ۔"

دعوت عمل

آگ لگی تو سارا محلہ جل گیا۔ صرف ایک دکان بچ گئی۔ جس کی پیشانی پر یہ بورڈ آویزاں تھا۔

"یہاں عمارت سازی کا جملہ سامان ملتا ہے۔" ● ● ●

ادارہ

منٹو ۔۔۔ (زندگی کا ایک اجمالی خاکہ)

سعادت حسن منٹو ۱۱ رمئی ۱۹۱۲ء کو سمبرالا (ضلع لدھیانہ) میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم امرتسر میں حاصل کی۔ اپنی آزاد مزاجی کے سبب پنجاب یونیورسٹی سے تیسری کوشش میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ علیگڑھ یونیورسٹی میں بھی کچھ دن تعلیم حاصل کی لیکن یہ سلسلہ تا دیر جاری نہ رہ سکا۔ وہ ایک آسودہ حال خاندان سے تعلق رکھتا تھا مگر اس نے بچپن ہی میں اپنا گھر چھوڑ دیا تھا۔ اس کے دو بڑے بھائی ہندوستان سے باہر اونچے عہدوں پر مامور ہیں۔ جب وہ محض ایک طالب علم اور شریر لڑکا تھا۔ ایک وقت بھی اس کے ہاتھ میں "عبداللہ سگریٹ" کا ڈبہ دیکھا گیا۔ شوخی، شرارت اور ذہانت بات بات سے آشکار تھی۔ جب اس کی عمر بیس سال کی تھی تو ماسٹر اللہ رکھا نے امرتسر میں آگ پر چلنے کا مظاہرہ کیا، ایک دن ماسٹر اللہ رکھا نے اعلان کیا کہ جسے اپنے خدا پر بھروسہ اور مجھ پر اعتماد ہو وہ میرے ساتھ ان دہکتے انگاروں پر چل سکتا ہے۔ اس کا بال بیکا نہ ہوگا۔ مجمع پیچھے ہٹ گیا، کوئی ایک شخص آگے نہ بڑھا، ماسٹر نے پھر آواز لگائی تو اچانک مجمع کو چیرتا پھاڑتا ایک دبلا پتلا نوجوان آگے بڑھا۔ جوتے اور موزے اتارے، چوڑے پائجامے کے پائنچے اونچے کئے۔ آواز گونجی انگوٹھے اندر کر لو کلمہ پڑھو اور میرے ساتھ آجاؤ۔ مجمع سوچتا ہی رہا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اور وہ نوجوان ان دہکتے ہوئے انگاروں پر سے گزر بھی گیا۔ یہ تھا سعادت حسن جو اس وقت تک منٹو نہ بنا تھا۔ اس کے بعد منٹو ہمیشہ انگاروں پر چلتا رہا۔ اسے گالیاں دی گئیں۔ اس پر مقدمے چلائے گئے۔ اسے ضروریات زندگی کے پورا کرنے میں شدید مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔

کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ شریر لڑکا آگے چل کر ایک عظیم اور منفرد فن کار بن جائے گا۔ بے مثال محنت، ہنگامی طرز فکر اور نئے پن سے کام لے گا۔ زندگی کے لئے ایک انوکھی شاہراہ متعین کرے گا اور اپنی منزل کو پا کر ہی دم لے گا۔ چنانچہ اس نے اتنی تیز گامی سے کام لیا کہ صرف ۴۳ سال کی عمر میں اس منزل کو پالیا اور وہ اب اپنی آخری منزل میں بڑے سکون کے ساتھ دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک ابدی نیند سو رہا ہے۔ کبھی نہ ٹوٹنے والی نیند۔

تلاش معاش میں وہ لاہور، دہلی اور بمبئی میں رہا۔ تقریباً دو سال آل انڈیا ریڈیو دہلی میں کام کیا۔ اس نے ریڈیائی ڈراموں کی داغ بیل ڈالی۔ غالباً ۱۹۴۲ء میں وہ وہاں تھا اس وقت کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک، ن۔ م۔ راشد اور دیوندر ستیارتھی بھی وہیں تھے۔ اس ابتدائی دور میں بھی منٹو کی انفرادیت، ذہانت اور بے باکی اسی طرح تھی جیسی کہ اس کی بعد کی زندگی میں پائی گئی۔ دہلی سے وہ بمبئی آ گیا۔ یہاں امپیریل فلم کمپنی۔ سروج مووی ٹون، بمبئی ٹاکیز اور فلمستان میں افسانہ و مکالمہ نگار اور منظر نویس کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ اسی زمانے میں ہفت روزہ مصور بمبئی، ہفت روزہ کارواں بمبئی اور ہفت روزہ کہکشاں کے ادارتی فرائض انجام دیئے۔ فلم "آٹھ دن" میں بطور اداکار کام کیا۔ کیچڑ، بنجارا، بیگم، آٹھ دن، چل چل رے نوجوان۔ آغوش اور مرزا غالب، سات فلمی کہانیاں لکھیں۔ ۱۹۴۷ء کے انقلاب میں ہندوستان سے پاکستان چلا گیا۔ تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے بعد اس نے روزنامہ مساوات امرتسر اور لاہور کے ہفت روزہ پارس، ماہنامہ ہمایوں، ماہنامہ عالمگیر، سہ ماہی اردو ادب، روزنامہ احسان، روزنامہ منشور، اور روزنامہ مغربی پاکستان کے ادارہ میں بھی کام کیا۔

اس کا پہلا افسانہ "تماشہ" تھا جو اس نے جلیانوالا باغ کے حادثہ سے متاثر ہو کر لکھا اور فرضی نام سے چھپوایا۔ لاہور آ کر ماہنامہ عالمگیر کا "روسی ادب نمبر" مرتب کیا اور پھر افسانہ نگاری کی طرف اس طرح متوجہ ہوا کہ چند سال ہی میں چونتیس کتابوں کا مصنف بن گیا اس کی کتابوں کے کئی کئی ایڈیشن چھپے ہیں۔ اس کی مطبوعہ کتابوں کے نام یہ ہیں:

منٹو کے افسانے :عصمت چغتائی، نمرود کی خدائی، گنجے فرشتے، پردے کے پیچھے، شکاری عورتیں، کروٹ

منٹو کے مضامین :چغد، سیاہ حاشئے، بادشاہت کا خاتمہ، سرکنڈوں کے پیچھے، منٹو کے ڈرامے، سرگذشت اسیر

افسانے اور ڈرامے :لذت سنگ، خالی بوتلیں، خالی ڈبے، نور جہاں سرور جہاں، پھندنے، آؤ، ویرا

آتش پارے :یزید، تلخ، ترش اور شیریں، اوپر، نیچے، درمیان، برقعے، جنازے، گوری کے افسانے

دھواں، ٹھنڈا گوشت، سڑک کے کنارے، شیطان، مینا بازار، تین عورتیں

ہر کتاب میں اس کے کئی کئی افسانے اور ڈرامے ہیں جن میں سے بعض کو بالاتفاق شاہکار قرار دیا گیا ہے۔ زیر طبع کتابیں گلاب کا پھول، ناخن کا قرض، لاؤڈ اسپیکر، چشم زدن اور بغیر عنوان کے، ہیں۔ اس کی اکثر کہانیاں ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ کی گئی ہیں۔

لاہور آنے کے بعد ضروریات زندگی پورا کرنے کے لئے منٹو کو سخت محنت کرنا پڑی۔ ایک موقع پر خود اس نے اپنے ایک دوست سے کہا "یار، میں آدمی ہوں یا کیا ہوں، ایمان سے اتنی محنت تو کوئی بے ایمان نہیں کرتا۔ رات کے دو بجے سے اب تک دو افسانے لکھ چکا ہوں۔ اب تمہارے لئے فکر کر رہا تھا، تم نہ آتے تو شاید لکھ مارتا۔"

یہ واقعہ ہے کہ اپنی آخری زندگی میں اسے دو تین افسانے روزانہ لکھنے پڑے۔ اس کا خرچ تقریباً ۳۰ تیس روپیہ یومیہ تھا۔ تنہا قلم کے ذریعہ ہندوستان اور پاکستان میں کسی ادیب کا تیس روپیہ روز کمانا ایک معجزہ ہے۔ وہ ایک ہی نشست میں طویل سے طویل افسانہ ختم کر دیتا تھا۔ اپنے سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں ایک باریک کرتے اور بڑے پائنچوں کے پائجامے میں ملبوس، آرام کرسی پر ٹانگیں سکیڑے، وہ اس تیزی سے لکھتا تھا کہ گویا اسے کہانی حفظ ہے اور وہ اسے کاغذ پر منتقل کر رہا ہے۔ کہانی شروع کرنے سے پہلے چند ساعت وہ بے چین ضرور نظر آتا تھا، دو چار بار قلم کو منہ میں دبا تا پھر کاغذ پر بسم اللہ کے اعداد ۷۸۶ لکھتا اور اس کا قلم دوڑنے لگتا۔ کہانی ختم کی اور کسی بھی رسالہ کے دفتر میں جا کر اس کا معاوضہ لے آیا، پھر دوسری شروع کر دی۔ جب چند کہانیاں جمع ہو جاتی تھیں تو کسی ناشر سے معاملہ کر کے رقم لے لیا کرتا تھا۔ ایڈیٹر اور ناشر اس کے افسانوں اور مجموعوں کے منتظر رہتے تھے۔ وہ اپنے افسانوں میں کسی کی تحریف برداشت نہیں کرتا تھا اور نہ کبھی کسی دوسرے ادیب یا افسانہ نگار کو سناتا تھا۔ اس میں "انا" اور خود پرستی کا زبردست جذبہ تھا اور اسی "انا" نے اسے بڑا افسانہ نگار بنا دیا۔ وہ شدید قسم کا احساس برتری رکھتا تھا۔ اٹھتے، بیٹھتے، لکھتے پڑھتے کوئی نہ کوئی ایسی حرکت کرنا ضروری سمجھتا تھا جس پر لوگ چونک پڑیں۔ ایک معمولی سی بات ہے کہ وہ ہمیشہ تانگہ میں کوچوان کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھا کرتا تھا اس کا کوئی محبوب سے محبوب دوست بھی اس جگہ نہیں بیٹھ سکتا تھا اور اگر کبھی ایسا ہو جاتا تو وہ دوسرا تانگہ لے لیتا اور کوچوان کے پاس اگلی نشست پر بیٹھ کر اس سے کہتا "تانگہ" میرے یار کے اس تانگہ سے آگے دوڑاؤ۔"

اس کی گفتگو اس کی تحریر کی طرح شستہ درفتہ نہیں ہوتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی بات کہنے کے لئے الفاظ کو جنم دے رہا ہے۔ رُک رُک کر، اٹک اٹک کر۔ مگر کسی خاص تاثر کے تحت وہ کبھی کبھی گفتگو میں بلا کا تیز اور طرار بھی ہو جاتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے جملے بولنے کا عادی تھا۔ فقروں میں برجستگی۔ طنز۔ مزاح اُپج اور انوکھا پن ہوتا تھا۔ اسے عام طور پر شعر اور شعر کہنے والے لوگوں کے نام یاد نہیں رہتے تھے۔ حافظہ پر زور ڈالنے کے باوجود جب کوئی نام یا شعر یاد نہ آتا تو "چلو دفع کرو" کہہ کر چھوڑ دیتا۔ جب دوستوں کے ساتھ شراب پیتا تو اس کی زبان پر اکثر یہ فقرہ آتا۔ "اٹھاؤ گلاس اور مارو جھک" اردو کی محفلوں میں بھی وہ پنجابی بولا کرتا تھا۔ پنجابی زبان اسے بہت محبوب تھی۔ لیکن گھر میں اپنی بچیوں سے ہمیشہ اردو میں بات کرتا۔

اس کی شخصیت اور فطرت میں غیر معمولی انوکھا پن تھا اور بلا کی جاذبیت پائی جاتی تھی۔ ایک مقناطیسی اثر تھا اس کی آنکھوں اور اس کی زبان میں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے خوب صورت اور نحیف جسم میں کچھ برقی لہریں ہیں۔ حرکات و سکنات میں اضطرابی کیفیت ہوتی تھی۔ گفتگو کے دوران میں تمام اعضا حرکت کرتے تھے۔ چہرے پر کچھ رنگ آتے اور کچھ جاتے۔ یوں لگتا جیسے اسکرین پر کوئی تصویر تیزی کے ساتھ حرکت کر رہی ہے۔

وہ ترقی پسند افسانہ نگار ہوتے ہوئے بھی خود کو ترقی پسند جماعت کا رکن نہیں سمجھتا تھا۔ وہ ادب کو خانوں میں بانٹنے کا قائل نہ تھا وہ کہا کرتا تھا کہ میں کسی صف میں شریک ہو کر اپنی انفرادیت ختم کرنا نہیں چاہتا۔ "ہدایت نامۂ خاوند کوئی ادیب گوارا نہیں کر سکتا۔" وہ نعرہ بازی کے بھی سخت خلاف تھا اور بے تحاشہ بے روک ٹوک لکھنے کا عادی۔ اس کا خیال تھا کہ جب تک زندگی کی مکروہ صورتوں کو سامنے نہ لایا جائے اور عوام کو انہیں کی زبان میں ان کے مکروہ چہرے اور سڑے ہوئے زخم نہ دکھائے جائیں، معاشرہ کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ وعظ و پند سے سوسائٹی کی خرابیاں دور نہیں ہو سکتیں۔ سوسائٹی کو ہوش میں لانے کے لئے طنز کے نشتروں اور گھناؤنی تصویروں کی ضرورت ہے اس کو اسی کے آئینہ میں اس کے مکروہ خدو خال دکھانے چاہئیں۔

اس کے افسانے پڑھنے کے بعد ہر قاری نے اپنی جگہ یہ محسوس کیا کہ وہ بڑا غلط قسم کا شرابی، اوباش، بے حد آوارہ، اور عورتوں کا رسیا ہوگا، اس کے یہاں عریانی، گندگی، مزاحمہ، بے حیائی اور شراب کی بوتلوں کی کھڑ کھڑاہٹ پائی گئی اور آج کے ماحول کی تمام تر غلاظتیں بھی اس کے افسانوں میں ملیں۔ لیکن اس کے مشاہدہ، باریک بینی اور فنکارانہ انداز فکر و اسلوب سے اس کے بڑے سے بڑے دشمن کو بھی انکار کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ افسانوں کے ماحول سے ہٹ کر اس کی ذاتی زندگی میں پاکی، سچائی، دردمندی اور صفائی و ستھائی تھی۔ وہ کسی شریف عورت پر کبھی بُری نظر نہیں ڈالتا تھا۔ عورت کا احترام اس کی زندگی کا سب سے بڑا جزو تھا۔ شراب کے علاوہ اس نے دوسری برائیوں کو اپنے پاس نہ آنے دیا۔ ایک عظیم فن کار میں جو غیر معمولی خوبیاں اور صلاحیتیں ہونی چاہئیں وہ بدرجۂ اتم اس میں موجود تھیں۔ وہ ضروریات کی تکمیل کے سلسلے میں بے تکلف دوستوں سے زبردستی روپیہ وصول کرنے یا قرض مانگنے میں کوئی شرم، جھجک یا برائی محسوس نہیں کرتا تھا اور خود بھی اس کا ہاتھ اسی طرح بڑھا کرتا تھا اس نے انتہا سے زیادہ شراب پی مگر اس کا کردار، اس کا مذاق اور اس کا معیار پست نہ ہوا۔ جب بھی کوئی اس کے فلیٹ کا دروازہ کھٹکھٹاتا تو وہ نہایت صاف ستھرے لباس میں باہر نکلتا۔ مکان نہایت سلیقہ سے سجا رہتا۔ خصوصاً اس کا ڈرائنگ روم۔ اس کے دوستوں اور جاننے والوں کا حلقہ بے حد وسیع تھا۔ اس سے سب محبت اور عزت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ اس کا پاس و لحاظ کرتے تھے اور اکثر اس سے ڈرتے تھے، دبتے تھے، بچتے تھے۔ وہ ایک شریف بیوی کا وفادار شوہر اور تین بچیوں کا شفیق باپ تھا۔ اس کے سلیقہ اور صفائی کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی دوست سگرٹ کی راکھ "ایش ٹرے" میں ڈالنے کے بجائے فرش پر جھاڑ دیتا تو وہ بلا تکلف اس کے ہاتھ میں جھاڑو پکڑا دیا کرتا تھا اور کہتا "فرش صاف کرو۔"

مرنے سے صرف ایک دن پہلے ۱۷ر جنوری ۱۹۵۵ء کی دوپہر کو وہ گورنمنٹ کالج کے سامنے تانگہ پر بیٹھا ہوا دو لڑکوں کو بلا رہا تھا۔ غالباً اسے پیسوں کی ضرورت تھی۔ وہ زندگی کے آخری لمحات میں بہت زیادہ پینا چاہتا تھا۔ اس نے ۱۷ر کی صبح کو پی دوپہر میں پی، رات کو بھی پیتا رہا اور جب صبح اٹھا تو بھی پینے سے باز نہ آیا۔ اور بالآخر ۱۸ر جنوری کو صبح شراب نے اس کے جگر کو کاٹ دیا۔ خون کی قے ہوئی اور اسپتال لے جاتے لے جاتے راستہ ہی میں اس نے دم توڑ دیا۔

پہلے لاہور اور پھر پاکستان ریڈیو کے اعلان پر ہندو پاک کے گوشہ گوشہ میں منٹو کی موت کی اطلاع سرعت کے ساتھ پھیل گئی۔ ہر شخص ہکا بکا رہ گیا۔ اسے پسند اور ناپسند کرنے والے دونوں طبقوں کو ایک عجیب سا دکھ ہوا۔ ایسا غیر معمولی تاثر کم ادیبوں کی موت پر ابھرا ہے۔ موت کے بعد ہی اس کے گھر پر ناشروں، ایڈیٹروں، اخبار نویسوں، ادیبوں، شاعروں، دوستوں اور عزیزوں کی بھیڑ لگ گئی۔ اسی دن اسے میانوالی قبرستان میں ڈاکٹر تاثیر اور اختر شیرانی کے پہلو بہ پہلو پورے ادبی اعزاز کے ساتھ دفن کر دیا گیا۔ دوسرے دن ہندو پاک کے تمام اخبارات اس کے ذکر سے بھرے ہوئے تھے۔ طرح طرح کے ذکر اور تیسرے دن لاہور جیسی کتابوں کی بڑی منڈی میں کسی پبلشر اور کتب فروش کے یہاں اس کی کتابیں نہ تھیں۔ منٹو کو بُرا کہنے والے بھی اس کی موت کے بعد اس کی تصانیف لے گئے۔ مرنے کے چند دن بعد ہی اس کے افسانوں کے چار نئے مجموعے بازار میں آ گئے جو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہے ہیں۔ رسائل نمبر نکل رہے ہیں اور اس کے دوست ادیب۔ نقاد۔ شاعر۔ ایڈیٹر سب اس کی زندگی کے اوراق الٹ رہے ہیں۔ ہر شخص کوئی ایک نئی اور انوکھی بات اس کے سلسلے میں ضرور لکھ جاتا ہے۔

اس اتفاق کو کیا کہئے کہ ۱۸ر اگست ۱۹۵۴ء کو جب راولپنڈی میں ظفر زبیری نے اپنی "آٹو گراف بک" اس کے سامنے پیش کی تو وہ اسے دیکھ کر مسکرایا، پھر ایک صفحہ پر ۸۶ لکھ کر ذیل کی عبارت لکھ دی۔

کتبہ

یہاں سعادت حسن منٹو دفن ہے۔ اس کے سینے میں فن افسانہ نگاری کے سارے اسرار و رموز
دفن ہیں۔ وہ اب بھی منوں مٹی کے نیچے سوچ رہا ہے کہ وہ بڑا افسانہ نگار ہے، یا خدا

سعادت حسن منٹو (۱۸ر اگست ۱۹۵۴ء)

اور ٹھیک ۶ مہینہ بعد اسی تاریخ کو (۱۸ر جنوری ۱۹۵۵ء) یہ بڑا افسانہ نگار منوں مٹی کے نیچے دفن کر دیا گیا۔ غالباً اسی کا لکھا ہوا مندرجہ بالا "کتبہ" بھی اس کے قبر پر لگا دیا گیا ہو گا جو ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے اور عبرت قلب و نظر ہے۔ ●

مکتوبات

رشید احمد صدیقی (علی گڑھ)

گرامی نامہ مورخہ ۱۷ ؍فروری مجھے ۱۸؍ کو مل گیا تھا۔ میں نے ڈاکٹر محمد حسن صاحب سے ضرور عرض کیا تھا لیکن اب کچھ ایسی مجبوری آن پڑی ہے کہ یہ وعدہ پورا نہ کرسکوں گا۔ مجھے بڑی ندامت ہے اور افسوس بھی کہ تعمیل ارشاد نہ کرسکا۔ معاف فرمایا جاؤں۔

سید احتشام حسین رضوی (لکھنؤ)

آپ کا تار ملا اس سے پہلے خط ملا تھا۔ بے حد شرمندہ ہوں۔ ادھر میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ ہر روز کچھ لکھنے کا ارادہ کرکے بیٹھتا ہوں اور ایک حرف نہیں لکھ سکتا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس خیال سے کتنی کوفت ہے کہ میری وجہ سے رسالہ میں تاخیر ہو رہی ہے اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح مایوس کروں اور کیا لکھوں۔ یقین کیجئے کہ میری طبیعت ایسی ہی خراب ہے کہ خطوں تک کے جواب نہیں لکھ رہا ہوں۔ اگر اس ماہ کے آخر تک بھی چند صفحات لکھ سکا تو ایکسپریس ڈیلیوری سے بھیج دوں گا۔ اگر کسی طرح میرے بغیر رسالہ نکل سکتا ہے تو ہرگز ایک دن کی تاخیر بھی نہ کیجئے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں (علی گڑھ)

آپ کے دعوت نامے کا جواب تاخیر سے دے رہا ہوں اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ ادھر مسلسل علالت کی وجہ سے کچھ بھی نہیں لکھ سکوں گا۔ ویسے مجھے شاعر عزیز ہے اور بڑے شوق سے اسے پڑھتا ہوں امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ کچھ عرصہ ہوا آگرہ گیا تھا آپ کا تذکرہ ہر بزم میں رہا۔

اوپندر ناتھ اشک (الہ آباد)

خط ملا۔ میرے ہاں مہمان آئے ہوئے ہیں اور کام کا زور ہے۔ پھر بھی میں منٹو پر کچھ لکھنے کی کوشش کروں گا۔ لکھنا چاہیے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ لکھوں گا بھی ضرور۔ ابھی لکھ سکوں تو بہت اچھا ہو۔ کوشش کروں گا۔

ڈاکٹر محمد حسن (علی گڑھ)

خط کے لئے شکریہ۔ نیت بخیر تھی اور منٹو پر اب تک میرے تاثرات آپ تک پہنچ چکے ہوتے۔ یکا یک فیر نجانس کا حملہ ہوا اور اس قدر شدید کہ بس جانبر ہو گیا۔ یہ خط بھی بستر علالت ہی پر سے لکھ رہا ہوں ابھی تک غذا نہیں ملی ہے۔ مجھے منٹو پر کچھ نہ لکھ پانے کا بے حد افسوس ہے آپ جانتے ہیں منٹو میرا محبوب فن کار ہے۔ پارے اب مجبور ہوں۔ آپ مناسب سمجھیں تو میرے انگریزی مضمون کا ترجمہ شائع کر دیں جو غالباً اتوار ۷ ؍فروری کے times of india میں چھپا ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی (لاہور)

منٹو نمبر کے لئے ضرور کچھ نہ کچھ لکھنا چاہتا ہوں لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنی جلدی کیا لکھوں۔ کوئی بات ذہن میں نہیں آرہی ہے کوشش کر رہا ہوں اگر دو چار صفحے ہو گئے تو بھیج دوں گا۔ لیکن ۲۰ فروری سے قبل شاید ممکن نہ ہو سکے۔

"شاعر" پابندی سے ملتا ہے۔ افسوس ہے بہت دنوں سے اس کے لئے نہ لکھ سکا۔ لاہور کا ماحول کچھ ایسا ہے کہ باہر مضمون بھیجنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ رسالے والے سر پر سوار رہتے ہیں۔

مجنوں گورکھپوری

آپ کا خط مجنوں صاحب کو ملا تھا۔ جواب فوراً نہ دئے جانے کا افسوس ہے اور ندامت بھی۔ مگر مجنوں صاحب کی مصروفیت بے پناہ ہے ان دنوں خیال سے بات اتر گئی۔ انہوں نے جواباً یہ کہا ہے کہ آج کل وہ بری طرح سے چند کاموں میں پھنسے ہوئے ہیں اور لطف یہ کہ صحت الگ مسلسل دھمکیاں دے رہی ہے، برے بھلے وہ اپنی منصبی فرائض ہی ادا کر دیتے ہیں، یہی بڑی بات ہے۔ "منٹو نمبر" کے لئے وہ موجودہ حالات میں لکھنے سے معذور ہیں، جس کا انھیں کچھ کم دکھ نہیں ہے۔ آپ معاف کریں گے۔ اس کی پوری امید ہے "منٹو نمبر" دیکھنے کے لئے بے چینی سے انتظار کریں گے۔

خیر اندیش قمر عالم

مرزا ادیب (لاہور)

کل آپ کا خط ملا۔ پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے جو کچھ کہا تھا میرے نقطۂ نظر میں صحیح تھا۔ واقعی آپ بہت کام کر رہے ہیں۔ مجھے تو حیرت اس بات پر رہتی ہے کہ آپ میں کام کرنے کی اتنی ہمت کہاں سے آ گئی۔ کوئی اور ہوتا تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر نہ جانے کہاں پہنچ چکا ہوتا۔ شاعر کی موجودہ پالیسی بھی قابل قدر ہے۔ آپ کا اداریہ بڑی دلچسپی سے پڑھا کرتا ہوں۔ ہاں بھائی "افسانہ نمبر" جہاں سے بھی مل سکے۔ جس حالت میں بھی مل سکے۔ ایک کاپی ضرور بالضرور بھیجوائیے۔ اگر خراب و خستہ حالت میں ہو جب بھی کوئی بات نہیں افسانہ نمبر ضرور پڑھنا ہے مجھے۔ یہ کام بطور خاص کیجئے گا۔

میں اب باہر جا رہا ہوں۔ واپس آ کر منٹو مرحوم کے بارے میں ضرور کچھ لکھ کر ارسال خدمت کر دوں گا۔

وارث حسین علوی (احمد آباد)

پریشانیوں اور مصائب میں آپ گھرے ہونے کے باوجود جو کام کر رہے ہیں انھیں دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ آپ کی کچھ خدمت کرسکوں۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں اور کس طرح کروں۔ کاش میں آپ کے قریب ہوتا اور آپ کے لئے کچھ کرسکتا۔ مجھے معلوم نہیں "منٹو نمبر" کے لئے آپ کو کیا مواد ملا ہے۔ اور آپ نے کس طرح اسے حاصل کیا ہے۔ آپ کی کاوشوں کا اندازہ تو نمبر دیکھنے کے بعد ہی ہوگا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہندوستان کے بڑے ادیب ہندوستانی پرچوں کے لئے کیوں نہیں لکھتے۔ نہ جانے کیوں سردار جعفری نے تبرکاً دو صفحے لکھے۔ شکیل الرحمٰن نے دو صفحے لکھے۔ آخر یہ کیا ہو رہا ہے لوگوں نے کیا تماشہ بنا رکھا ہے۔ ادب کو کیوں ایک مشغلہ سمجھ بیٹھے ہیں یقین مانئے اعجاز صاحب اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو پاگل ہو جاتا۔ اور شاعر کو بند کر کے چنے کی دکان کھول لیتا۔ آخر آپ بھی کیا کرسکتے ہیں۔ کسی کے کاندھوں پر سوار ہو کر تو نہیں لکھوا سکتے۔ لیکن مجھے امید ہے کہ یہ سہل انگاری اور شہرت بٹورنے کا دور بھی کبھی نہ کبھی ختم ہوگا اور لوگ سنجیدگی اور متانت سے ادب کی طرف اپنی ذمہ داری کو محسوس کرنے لگیں گے۔ میں صرف یہی دیکھنا چاہتا ہوں کہ اس دور کو نزدیک لانے میں شاعر کہاں تک کامیاب ہوتا ہے۔ اگر وہ کامیاب ہو گیا تو یہ بڑا کام ہوگا۔

زرسالانہ ختم ہونے کی اطلاع

ریپر پر آپ کے پتے کے ساتھ خریداری نمبر درج ہے۔ جس مہینے میں آپ کی مدت خریداری ختم ہوئی تھی خریداری نمبر کے سامنے وہ مہینہ سال درج کیا گیا ہے۔

اگر ✓ یہ نشان لگا ہوا ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نومبر ۲۰۱۲ء کے اس شمارے کے ساتھ آپ کی مدت خریداری ختم ہو رہی ہے۔ از راہ کرم زرسالانہ جلد از جلد بھجوا کر شاعر کو وقت پر شائع کرنے میں اپنا تعاون دیجئے۔ اگر منی آرڈر نہ بھیج سکیں تو دفتر کو زرسالانہ کا وی پی بھیجنے کی ہدایت کریں۔ بیرونی ممالک کے خریدار حضرات چیک یا ڈرافٹ THE SHAIR BOMBAY کے نام سے بھیجا کریں۔

ادارہ

محفل اپنی---

مآلِ سعیِ پیہم

ڈیڑھ دو ماہ کی مسلسل کوشش کا نتیجہ "منٹو نمبر" کی صورت میں قارئین کے سامنے ہے۔ یہ اعلان کے مطابق ڈیڑھ سو صفحات کا نہیں بلکہ صرف ۱۰۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ مارچ کے بجائے اپریل میں شائع ہو رہا ہے۔ اس میں منٹو مرحوم کی وہ تصاویر نہیں جو ہم شائع کرنا چاہتے تھے اور جن کے لئے ہم نے پاکستانی احباب کو لکھا بھی۔ اس کے باوجود شخصیت پر یہ مخصوص اشاعت وزنی ہے معیاری ہے اور خوب صورت ہے۔ ہاں ہمیں اس کا اعتراف ضرور ہے کہ یہ بھرپور نہیں۔ اسے بھرپور بنانے کے لئے ہم نے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوششوں اور کاوشوں کی کلائیاں مڑتی ہی چلی جاتی ہیں، جد و جہد کے پسینے ایک لمحہ کے لئے نہیں سوکھتے، پھر بھی کامیابی نہیں ہوتی۔ ہم نے جن بڑے ادیبوں کو منٹو نمبر کے لکھنے کی دعوت دی تھی ان میں سے نوے فیصدی نے پختہ وعدے کر لئے تھے۔ یہ وعدے محض رسمی وعدے نہ تھے، یا وعدہ کرنے والے ایسے نہ تھے جو اپنی اہمیت محسوس نہ کریں۔ لیکن یہ ہم جانتے ہیں کہ ان میں سے اکثر کو اس طرح غیر متوقع حادثات نے گھیر لیا کہ وہ ادارہ کے مسلسل سادہ خط۔ تار اور ایکسپریس خطوط کے باوجود کچھ نہ لکھ سکے۔ نیت سب کی بخیر تھی، وعدوں کا پاس سب کو تھا۔ تعلقات اور ذمہ داریوں کا احساس اپنی جگہ سب نے کیا۔ مگر مجبوریاں اور لاچاریاں بھی کچھ کم قوت نہیں رکھتیں اور ان پر کبھی کبھی غالب آنا بے حد مشکل ہو جاتا ہے۔ منٹو پر تاثراتی انداز میں کچھ لکھنا تو آسان ہے لیکن خالص تنقیدی انداز میں اس پر قلم اٹھانا مشکل نہیں تو فکر طلب ضرور ہے۔ ظاہر ہے کہ اضطراب و انتشار کے عالم میں اس اہم کام سے عہدہ برآ نہیں ہوا جا سکتا۔ اسی لئے ادیبوں نے "شاعر" کے نقصان، ادارے رنج و افسوس اور اپنی وعدہ شکنی کو گوارا کر لیا۔

ہندو پاک کے رسائل و اخبارات میں منٹو پر اب تک جتنے مضامین شائع ہوئے ہیں ان میں دو چار کے علاوہ سب کے سب محض تاثراتی ہیں۔ خود منٹو کی موت ایک گہرا تاثر ہے۔ اس لئے اس پر لکھنے والے بھی اس کی زندگی کے حالات و واقعات سے آگے نہیں بڑھ رہے ہیں۔ ان حالات و واقعات میں بھی منٹو کے مختلف رنگ اور روپ دیکھے جا سکتے ہیں۔ لیکن جب تک تاثرات کی شدت کم نہ ہو اس کے فن کو تنقیدی نظر سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ ہم صرف یہی چاہتے تھے کہ اس بے پناہ لکھنے والے کے فن کو جانچنے کی طرح جانچا جائے۔ "شاعر" کے "منٹو نمبر" میں زیادہ سے زیادہ تنقیدی مضامین ہوں اور ان کی روشنی میں اس کے فن کی خوبیاں اور خامیاں واضح طور پر سامنے آ جائیں۔ مگر معلوم ہوا کہ یہ کام کچھ وقت لے گا۔ ہنگامی طور پر اس سلسلے میں کچھ نہ ہو سکے گا۔ پھر بھی ہم اس مختصر سے نمبر میں تنقیدات کے باب کے تحت جو مضامین پیش کر رہے ہیں وہ بڑے اہم اور فکر انگیز ہیں۔ "منٹو نمبر" کا یہی باب طویل اور سب سے وزنی ہے۔ تاثرات کا باب مختصر، ہلکا پھلکا اور بے حد دلچسپ ہے۔ "منتخبات" میں بھی ہم نے اپنا زاویۂ انتخاب سب سے الگ رکھا ہے اور کوشش کی ہے کہ منٹو کی ایسی تخلیقات پیش کریں جو ایک طرف اس کے فن کی بلندی کا احساس کرا سکیں تو دوسری طرف اس الزامی زد میں نہ آ سکیں جس کی وجہ سے منٹو بعض سنجیدہ حلقوں میں زندگی بھر مطعون رہا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ "منٹو نمبر" میں پیش کردہ مواد منٹو مرحوم کا بھرا اقتباس احاطہ کر لیتا ہے۔ "منٹو نمبر" کو ہم نے "خبر نامہ" نہیں بننے دیا ہے اور اس چھوٹے سے "خاص نمبر" کا یہی امتیاز ہے۔ اس میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کا کوئی مضمون مطبوعہ نہیں۔ کسی شخصیت پر ارتجالی طور سے غیر مطبوعہ مواد فراہم کرنا یقیناً مشکل ہوتا ہے اور منٹو کے سلسلے میں تو عجیب بات یہ ہے کہ سب لکھ رہے ہیں اور سب چھاپ رہے ہیں، مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کی تخصیص کے بغیر۔

Khao Dil Se...
Kwality
PREMIUM PRODUCTS
Kwality
Anytime
Toast
Kwality
Khari
Kwality
Anytime
PREMIUM BREAD
Khao Dil Se...
Kwality
KWALITY CONFECTIONERS
& BAKERS INDIA PVT LTD

R. N. I. NO.-14482/1957 Postal Regd. No. MH/MR/SOUTH/134/2012-14

The "SHAIR" Monthly Bombay - 400004

PRICE Rs. 18/- Tel : 23829904 VOLUME 56 ISSUE NO. 11 - November - 2012

Published 5th & 6th of every month, Posted 12th & 13th of every month. Post at Mumbai Patrika Channel Sorting Office Mumbai - 1

Printed, Published & Owned by NAZIR NOMAN SIDDIQUI Printed at AL-AMIN PRINTERS

And Published from 202/228 Dinath Building 3rd Floor, Room No. 17, R. B. Marg, Mumbai - 400004

Editor IFTIKHAR IMAM SIDDIQUI